رجسٹر نمبر ایل ۵۲۳۰

جلد ۵۱ عدد [illegible]

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۱	بابت ماہ فروری ۱۹۵۹ء	عدد ۵

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

زیردستوں پر زبردستوں کے ظلم واستبداد کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ مدنی الطبع انسان کی زندگی۔ ظلم وعدوان کے ہتھیار بلاشبہ وقت کے تقاضوں کے تحت مختلف سانچوں میں ڈھلتے رہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ انسانی کے چند مختصر ادوار کو چھوڑ کر جن میں انسانوں کی سیادت وقیادت خداشناس اور خودشناس لوگوں کے ہاتھوں میں رہی دنیا کے ہر طاقتور گروہ نے کمزوروں پر مظالم ڈھائے۔ وہ لوگ جنہیں قدرت نے مادی وسائل سے مالامال کیا تھا، علم وحکمت کے بیش بہا خزانے اُن کے ہاتھ میں دیئے تھے اور قوت وحکومت سے سرفراز فرما کر انہیں سربلندی عطا کی تھی۔ انہوں نے بدقسمتی سے انسانوں کی دستگیری کرنے اور انسانوں پر انسانوں کے ظلم وستم کو روکنے کی بجائے کبر ونخوت سے سرشار ہو کر نوع انسانی پر دستِ استبداد دراز کرنا شروع کیا۔ وہ انسانیت کے لیے خیر وفلاح کا ذریعہ بننے بلکہ اس کے برعکس خونریزی، سفاکی اور زبردست آزاری کے دیو ثابت ہوئے۔ ملوکیت اور استعمار کے نشہ نے انہیں اتنا بدمست کر رکھا تھا کہ وہ اپنے سارے فرائض بھول گئے اور دنیا کے کمزور اور محتاج انسانوں کو اپنی اور اپنے مخصوص گروہ کی ہوسناکی کی بھینٹ چڑھا دیا۔

تاریخ کی انسانیت کے خلاف یہ شہادت خواہ کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو مگر ہے یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت۔ ممکن ہے ہم انسانوں کے بعض ظالمانہ اعمال کی کوئی تسلی بخش توجیہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم بعض کو دلائل سے جھٹلا بھی سکیں مگر انسان کے ہاتھوں انسانیت کی بربادی کی اس لمبی اور دلفگار داستان کو جو لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں واقعات سے عبارت ہے اور جس کے بعض ابواب بالکل ہماری آنکھوں کے سامنے لکھے گئے ہیں اور اُن کی سیاہی بھی خشک

نہیں ہونے پائی، اُسے آخر ایک حقیقت پسند انسان مکمل طور پر کس طرح رد کر سکتا ہے، البتہ جو چیز تسلیم کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ زبردست آزاری کی صورتیں حالات کے مطابق مسلسل بدلتی رہیں۔

اس مقام پر پہنچ کر ایک شخص کے ذہن میں بالکل قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانیت کا خمیر ہی شر و فساد اور ظلم و استبداد سے اٹھایا گیا ہے اور بیچارا انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے دوسرے انسانوں پر دست درازی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور اور بے بس پاتا ہے؟ جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں تو اس کا جواب نفی میں پاتے ہیں۔ اگر یہ ظلم و زیادتی انسانی فطرت کا جزو اعظم ہوتی تو انسانیت اس کے تدارک کے لیے کبھی بھی اتنی بے چین اور فکرمند نہ ہوتی جتنی کہ وہ ہمیشہ سے رہی ہے۔ تاریخ انسانی میں ہمیں بلاشبہ جارحانہ اقدام کے لاتعداد روح فرسا واقعات نظر آتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ ہماری نگاہیں اُن مخلصانہ کوششوں سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتیں جو انہیں روکنے کے لیے وقتاً فوقتاً کی جاتی رہی ہیں۔ یہ مختلف دفاعی تدابیر، یہ بین الاقوامی معاہدات، اور قیام امن کے لیے یہ بے شمار تنظیمیں آخر انسان کی کس خواہش کا مظہر ہیں۔ ان سب کے پیچھے جو جذبہ کام کرتا ہے وہ یہی تو ہے کہ دنیا سے کسی طرح ظلم و فساد مٹے اور انسان ایک بہتر اور پرامن زندگی بسر کرنے کے قابل ہو۔

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ اگر یہ زبردست آزاری انسانی فطرت کا لازمی جزو نہیں تو پھر یہ کس چیز کا نتیجہ ہے؟

جب ہم انسان کی خلقت پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالق کائنات نے انسان کو ایک ایسا دلِ بیتاب دیا ہے جو اُس کی زندگی میں حرکت اور قوت پیدا کرتا ہے، جس کے طفیل اُس کے اندر نئی نئی خواہشات کی تخلیق ہوتی ہے اور اس طرح وہ اپنی توسیع و بقا کا سامان مہیا کرنے کے لیے ہر آن کوشاں رہتا ہے۔ اسی سے سارے تخیلات و تمنیات متنفس ہوتے ہیں۔ یہ

"تب و تاب جاودانی" ہی زندگی کی اصل علامت ہے۔ یہ زندگی کے نظم و ربط کا مرکزی نقطہ ہے۔ اسی نقطہ کے گرد انسانی شخصیت اپنا استحکام و تحقق کرتی ہے اور اسی کے بل بوتے پر وہ اپنے نمو اور بقا کے لیے عمل کے بے پایاں امکانات تلاش کرتی ہے۔ یہ انسان کو کسی منزل پر بھی سکون و آرام سے بیٹھنے نہیں دیتی بلکہ ہر منزل پر اُسے نئی نئی منزلوں تک پہنچنے کے لیے سرگرمِ عمل رکھتی ہے۔

جب ہم اس "پر اسرار شے" کے عمل کو دیکھتے ہیں تو اسے کسی طرح بھی انسانیت کے حق میں ضرر رساں نہیں پاتے بلکہ اسے ہر لحاظ سے نوعِ بشری کے لیے مفید اور کارآمد سمجھتے ہیں۔ اسی کی بدولت ہمارے اندر عمل کی خواہش، کچھ ہونے کی تمنا اور اپنی خداداد قوتوں اور صلاحیتوں کو ایک راہ پر ڈالنے کا ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہم سب جمادات کی طرح بے حس و حرکت پڑے رہیں۔

مگر اسے انسانیت کی بدبختی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ شیطان اور اس کی ذریت نے عمل کے اس سب سے بڑے محرک کو بھی غلط راہوں پر ڈال کر اس سے انسانیت کو شدید نقصان پہنچانے کا سامان فراہم کیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ انسان کا دلِ بیتاب اس کائنات کے وسیع و پیچیدہ طلسم کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ نظامِ تکوینی کے پرے اس حقیقتِ کبریٰ کا بھی کھوج لگاتا جس کے بغیر اُس کا وجود ہستی کی وسعتوں میں بے معنی سا ہے اور پھر اس غیر محدود اور لامتناہی ذات کے ساتھ اپنا رشتۂ عبودیت استوار کر کے اس کے دیئے ہوئے ضابطوں کی پابندی کرتا۔ لیکن افسوس کہ یہ ناصبور دل مادّی زندگی کے طلسم ہوش ربا میں ایسا گرفتار ہوا کہ اس کے باہر وہ کسی چیز کو پا نہ سکا۔ اس آئینہ خانہ میں اُسے ہر پھر کر اپنی ہی ذات نظر آئی اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ یہ ساری کائنات اسی کے لیے پیدا کی گئی ہے، وہ بالکل غیر مسئول ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے اُس کے ذریعہ فطرت کے ازلی و ابدی پروگرام کی تکمیل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی اس بے قراری نے ان غلط اثرات کے تحت آ کر اور ان گمراہ کن احساسات کی آغوش میں پل کر ہوسناکی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اور "تگ و تاز" جو دل کی ناصبوری کا فطری نتیجہ ہے، زبردست آزاری کی

شکل میں رونما ہوئی ہے۔ استعماریت کی زہرہ گداز داستان پر ایک نگاہ ڈال لیجیے اور دیکھیے کہ کیا یہ ہوس ہی تو نہیں ہے۔ کیا یہ ہوس ناکی درحقیقت اس "تب و تابِ جاودانی" کی ایک مسخ شدہ صورت تو نہیں ہے۔

ان ابتدائی گذارشات کے بعد اب ہم جوع الارض ہی کی مختلف صورتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

اس سلسلہ کا آغاز ہم اُس دور سے کرتے ہیں کہ جب بادشاہ اور فرمانروا محض اپنی طاقت اور قوت کا لوہا منوانے کے لیے کمزور ممالک پر حملہ کیا کرتے تھے۔ آخر سوچیے کہ وہ کونسی ایسی چیز تھی جو انہیں اپنی سلطنت اور بادشاہت کے حدود سے نکال کر آس پاس کی اقوام کو تاخت و تاراج کرنے پر ابھارتی تھی۔ کیا افلاس انہیں اپنے گھر کو خیرباد کہنے اور دوسروں کے گھر میں جاگزیں ہونے پر مجبور کرتا، کیا ملک کی تنگ دامانی انہیں اس بات پر آمادہ کرتی کہ وہ اس کی حدود کو وسیع کریں۔ اگر ملک کی غربت ہی اُن کی ان مہمات کا بنیادی محرک ہوتی تو تاریخ ایک بالکل دوسرا رُخ اختیار کرتی۔ پھر جابرانہ اقدام دنیا کی مفلس اور نادار قوموں کی طرف سے کیا جاتا۔ پھر بے سروسامانی کسی قوم کی قوت کا واحد سامان ہوتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں ایسا نہیں ہوا بلکہ دنیا کے طاقتور گروہوں نے ہی کمزور انسانوں کو ہلاک کرنے کے منصوبے تیار کیے۔

اس کے علاوہ اگر اس لشکر کشی کا واحد مقصد اپنی قوم سے مفلسی کو دُور کرنا تھا تو ان مہمات کو سر کرنے کے بعد قوم کی معاشی سطح بلند کرنے کی سرتوڑ کوششیں کی جاتیں۔ لیکن تاریخ کے اوراق اس کے بالکل برعکس شہادت دیتے ہیں۔ فتح اور کامرانیوں نے ان فاتحین کے دماغ کو بالکل بگاڑ دیا۔ ایک طرف سلطنتوں پر سلطنتیں سرنگوں ہوتیں اور دوسری طرف ان لوگوں کی ریشہ دوانیوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا۔ یہ ظالم اور سفاک انسان غیروں کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنی قوم کے لیے بھی ظلم و جبر کے مجسمے تھے۔ وہ جن عوام کی ہمدردی کا بہانہ بنا کر انہیں دوسرے انسانوں کے خلاف ٹکرانے پر آمادہ کرتے، انہی کا خون چوستے اور اس سے اپنے شبستانِ عیش کے چراغ جلاتے۔ اپنے ملک کے لوگوں سے انہیں کوئی خاص ہمدردی نہ تھی۔ یہ لوگ اپنی ذات میں خدا بنے بیٹھے تھے اور سمجھتے تھے

کہ دنیا کی ہر ذی روح بلبے روح چیز اُن کی خواہش کے احترام میں قربان کی جاسکتی ہے۔

آج ہم جب ان بادشاہوں کے مظالم کے تذکرے پڑھتے ہیں تو ہمارا خون کھولنے لگتا ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں نے واقعی بڑی ہی انسانیت سوز حرکات کی تھیں جن پر ہم سب کو نفرین بھیجنی چاہیے۔

یہ سفاک بلاشبہ ہر قسم کی لعنت کے مستحق ہیں لیکن دیکھیے کہ ان کی یہ ظالمانہ حرکات انسانیت کے لیے بحیثیت مجموعی کہاں تک نقصان دہ تھیں۔

جب ہم ان لوگوں کے دائرۂ کار کا جائزہ لیتے ہیں تو اسے نہایت ہی محدود پاتے ہیں۔ ان شہنشاہوں کا "احساس انا" جس وقت شیطان کے نرغے میں آتا تو یہ سرپھرے ایک لشکر لیکر دوسری قوموں پر حملہ آور ہوتے۔ وہ سلطنتیں جو خراج دینے پر آمادہ ہو جاتیں اُن کو چھوڑ دیا جاتا اور وہ بادشاہ جو جنگ کے بغیر شکست ماننے پر آمادہ نہ ہوتے اُن کے حق میں قاضی شمشیر فیصلہ کرتا۔ اس رزم آرائی کے بعد اگر مناسب معلوم ہوتا تو شاہی خاندان اور فوج کے کچھ آدمی قتل یا قید کر لیے جاتے۔ ملکی خزانے میں اگر دولت ہوتی تو وہ چھین جاتی، اگر ملک کی کوئی حسینہ نگاہوں میں جچتی تو وہ اپنے حرم میں داخل کرلی جاتی۔ واپس جاتے ہوئے فاتح بادشاہ اپنی سواری کے ساتھ چند قیدی شہزادے باندھ لیتا تاکہ رعایا کو معلوم ہو جاتے کہ حضور مہمات سے کامیاب و کامران آتے ہیں۔ اس سے زیادہ ان فتوحات کا نہ کوئی مطلب تھا اور نہ ہی مقصد۔ زندگی کی جوئے نرم رو میں کسی قسم کا کوئی تلاطم نہ پیدا ہونے پاتا نہ تو لوگوں کے اندازِ زیست بدلتے اور نہ ہی اُن کے فکر و نگاہ کے زاویوں میں کوئی فرق واقع ہوتا۔ وہ اپنی زندگی کو اُسی نہج پر گزارتے چلے جاتے جو انہیں اپنے لیے پسند ہوتی۔ ان لڑائیوں میں فرماں روا تو بلاشبہ تبدیل ہوتے مگر زندگی کے انفرادی اور اجتماعی ڈھانچوں میں قطعاً کوئی تبدیلی واقع نہ ہونے پاتی۔

ان حالات میں دیکھیے کہ جب کسی شخص کے ذہن پر ہوسناکی کا بھوت سوار ہوتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ زندگی کے کتنے حصے کو متاثر کرتا ہے۔ اگر بربادی کا مبالغہ آمیز اندازہ بھی کیا جائے

تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ قوت و طاقت کے اس مظاہرہ میں چند سو نہ سہی، چند ہزار جانیں تلف ہوئیں کچھ سونا اور چاندی لٹا، دو چار عورتیں اغوا ہوئیں اور چند شہزادے قید ہوئے۔ لیکن اس میں نہ تو نظامِ تعلیم بدلا، نہ ہی نظامِ اخلاق زیر زبر ہوا، نہ ہی نظامِ معاشرت کو تہ و بالا کیا گیا۔ ان ریشہ دوانیوں کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ صرف محلات تک ہی محدود تھے۔

صنعتی انقلاب کے بعد اقتدار کے اس فتنہ نے بالکل ایک دوسری صورت اختیار کی۔

عقلی ترقی نے جو مغربی دنیا کے نزدیک دراصل مادّی ترقی ہی کا دوسرا نام ہے اُن سب رشتوں کو جنہیں قدیم مسیحی تہذیب نے ایک مرکزِ کائنات یعنی ذاتِ الٰہی سے وابستہ کر رکھا تھا، یکسر توڑ دیا۔ خالقِ کائنات کی پرستش کی جگہ اب سرمایہ سمجھنے لگا اور آدمی کے لیے خدا کی رضا جوئی کی بجائے خود اُس کی زندگی، خود اپنا آرام و آسائش مقصود بالذات بن گیا۔ دوسری دنیا کے ادھار پر انسان اس دنیا کے نقد کو ترجیح دینے لگا۔

یہ ایک ایسا زبردست زلزلہ تھا جس نے یورپ کی زندگی کے سارے اجزا کو تتر بتر کر دیا اور اس سے سیاسی زندگی میں، اجتماعی زندگی میں، ذہنی زندگی میں ایک انتشار رونما ہوا۔ تمدن کے اجزاء بکھرنے لگے، ریاست الگ ہوئی، علوم و فنون الگ، دین الگ، دنیا الگ، مذہب الگ، معیشت الگ۔ ان میں سے ہر چیز جدا اور بجائے خود مقصود بالذات بن گئی۔ تنوعاتِ عالم پر الگ الگ نظر پڑنے لگی۔ کسی کل میں اُن کے ربط کی تلاش نہ رہی۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوعِ انسانی کا شیرازہ جو مذہب کی مقناطیسی قوت نے باندھ رکھا تھا، وہ بہت جلد منتشر ہو گیا اور اس کے بعد خود غرضانہ افادیت نے اسے پھر سے ایک نئی سلک میں منسلک کیا۔

اس کے ساتھ ساتھ جدید سائنس بھی انفرادیت کو غیر معمولی حد تک ابھارنے میں ایک بہت بڑا ذریعہ بنی۔ سائنس کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ اس کے نتائج سب کے لیے ہوں۔ اس کے مخاطب جمہور ہیں اس لیے جب سائنس کو ترقی ہوئی تو ایک فرد بحیثیت فرد کے سوسائٹی میں اتنا اہم خیال کیا جانے

لگا کہ اس کی ذات کے لیے پورے سماج کو تباہ کیا جا سکتا تھا۔

فکر و نظر کی اس بنیادی تبدیلی سے قوت و طاقت کا وہ سرچشمہ جسے "حاکمیت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور جو صدیوں سے بادشاہوں کے تسلط میں چلا آ رہا تھا اُس کا قبضہ و اختیار اب عوام کے ہاتھوں میں منتقل ہوا اور اس کے نتیجے میں حاکمیتِ جمہور کا نظریہ بڑی تیزی کے ساتھ یورپ کے ہر ملک میں پھیلنے لگا۔

اہلِ یورپ اگر مادہ پرست ہونے کی بجائے خدا پرست ہوتے تو انفرادیت کا اُبھرتا ہوا یہ احساس اور فرد کی قوت و طاقت کا یہ نظریہ خواہ بالکل درست نہ سہی مگر انسانیت کے لیے اتنا مہلک نہ ثابت ہوتا جتنا کہ اس وقت ہوا ہے۔ مگر یہ وقت انسانیت کے لیے نہایت پُرآشوب تھا کہ ایک طرف تو قوت و طاقت کا منبع و مبدأ عوام کے ہاتھ آ گیا اور دوسری طرف حاکمیت کے یہ محافظ و پاسبان بڑی ہی ذلت کے ساتھ مادیت کے بت کے سامنے سجدہ ریز ہوئے۔

دنیوی فوائد و لذائذ کی بڑھتی ہوئی ہوس اس امر کی متقاضی تھی کہ عوام کسی ہیئتِ اجتماعی کی تشکیل کریں جس کی قوت و طاقت کی مدد سے وہ اپنے مادی مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوں۔ اس لیے انہوں نے معاہدہ عمرانی کے تحت اپنے ملک اور قوم کو حاکمیت کے حقوق تفویض کرنے شروع کیے۔ چنانچہ اس دور میں پورے یورپ میں مختلف مملکتیں اور اقوام زبردست قوت اور طاقت کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ ایک خدا پرست انسان اپنی زندگی میں جو حیثیت اپنے مالک اور خالق کو دیتا ہے وہی حیثیت اب ان سلطنتوں کو حاصل ہو گئی ہے۔ یہ جدید ریاستیں ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے یکسر آزاد ہیں کیونکہ ان سے بالاتر کوئی قوت تسلیم نہیں کی جاتی جس کے یہ تابع ہوں، بلکہ دنیا کی ہر چیز ان کے مفاد کے تابع ہے۔ پھر یہ اپنے تئیں ہمہ گیر خیال کرتی ہیں اور اس بات کی دعویدار ہیں کہ فرد اُن کی خاطر اپنے آپ کو بالکل مٹا ڈالے اور اپنی تمام خواہشوں کو ان کی مشیت کی قربان گاہ

پر بھینٹ چڑھا دے۔ اُس کی حیات و ممات انہی کی خاطر ہو، مانگے تو انہی سے مانگے اور جھکے تو انہی کے آگے جھکے۔ کیونکہ یہ نہ صرف عوام کی مرضی کی ترجمان ہیں بلکہ ان کی حاکمیت کا مظہر بھی ہیں۔

ان "تازہ خداؤں" کو جب قوت و طاقت کے نشہ نے بے چین کیا اور انہوں نے اپنی توسیع کا سامان مہیا کرنا چاہا تو کمزور قوموں پر ایک عجیب و غریب قسم کی مصیبت نازل ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نازل نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ یہ نیا استعمار صرف محلات پر ہی حملہ آور نہیں ہوتا بلکہ ہر گھر، ہر خاندان، اور ہر محلہ کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ پہلے بادشاہ اپنا تفوق و برتری ثابت کرنے کے لیے صرف شہزادوں کو قید کرتے، فوج کے بڑے بڑے افسروں کو موت کے گھاٹ اتارتے اور بیگمات کو اٹھا کر لے جاتے مگر جدید استعمار نے اپنی قوت و طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے مظلوم قوم کی معیشت کو تباہ کرنا شروع کیا۔

اس استعمار کا دائرۂ اثر پہلے استعمار سے کہیں زیادہ تھا۔ اس نے محلات کا رُخ کرنے کی بجائے منڈیوں کا رُخ کیا اور اس امر کی پوری کوشش کی کہ کسی طرح ان پر اس کا پورا تسلط قائم ہو جائے۔ کیونکہ اسے علم تھا کہ اس دور میں قوم کی قسمت کا فیصلہ سرمایہ کے ہاتھ میں ہے اور جو قوم اس معاملہ میں دوسری پر سبقت لے جائے گی وہی دنیا میں سب سے بڑی اور حکمران قوت ہو گی۔

لیکن اس ضمن میں یہ یاد رہے کہ سرمایہ کا حصول بذاتِ خود ان قوموں کا مقصد نہ تھا بلکہ مقصد کے حصول کا محض ایک ذریعہ۔ ان اقوام کا حقیقی مقصد صرف ایک ہی تھا کہ وہ اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ قوت و اقتدار حاصل کریں اور چونکہ عہد جدید میں اس کو حاصل کرنے کا سب سے موثر ذریعہ صرف یہی ایک تھا اس لیے انہوں نے اس راہ میں زبردست کوششیں کیں۔

اسے مادہ پرست انسان کی محض تاتجربہ کاری سمجھیے کہ اس نے استعمار کا دائرۂ کار تو یقیناً وسیع تر کیا مگر اسے کامیاب بنانے کے لیے کوئی نئے نئے طریقے ایجاد نہ کیے۔ پرانے شہنشاہوں کی طرح ہی پہلے کمزور اقوام کو تاکا جاتا اور پھر اُن پر فوج کشی کے ذریعہ اُن کی سیاسی قوت وطاقت درہم برہم کر دی جاتی۔ البتہ اس نئے استعمار نے جب مختلف ممالک کو سرنگوں کیا تو پھر ایسی تدابیر بھی اختیار کیں کہ ان ممالک کی دولت وثروت اُس کے خزانوں میں اپنے آپ منتقل ہوتی رہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی پوری طرح انتظام کیا گیا کہ محکوم قوموں کے اندر سیاسی شعور بیدار نہ ہونے پائے تاکہ استعمار کی جونک چپ چاپ ان کا لہو چاٹتی رہے اور ان بدنصیبوں کو خبر تک نہ ہو۔

دنیا کی کسی قوم کو سیاسی اور معاشی غلامی پر قانع کر لینا کوئی آسان اور سہل کام نہیں۔ اس کے لیے اگر ایک طرف بم برسا کر اس قوم کو کمزور کیا جاتا ہے تو دوسری طرف عیاریوں اور چالبازیوں سے بھی اُس کی قوتِ مدافعت کو ختم کرنے کی لاتعداد اسکیمیں تیار ہوتی ہیں۔ کسی قوم کے اموال پر ایک غیر معین مدت تک دست درازی صرف اُسی شکل میں کی جا سکتی ہے جبکہ وہ قوم اپنی اس تباہی پر خود راضی ہو جائے۔ اتنی بے بس ہو کہ اس ظلم اور زیادتی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرتی چلی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے غلام قوموں کے اندر تفرقہ ڈال کر انہیں خون ریزی اور برادر کشی میں اس طرح مصروف رکھا جاتا ہے کہ ان کے اندر باہر کے استعمار کے خلاف صف آرا ہونے کی سکت اور طاقت بھی باقی نہیں رہتی۔

استعمار کی یہ شکل ایسی ہے کہ یہ دنیا کے کسی حصہ میں زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ جذبۂ حریت کا جو جذبہ ظالم قوم کو مظلوم قوم کے خلاف جنگ آزما ہونے پر ابھارتا ہے وہی جذبہ کچھ دیر کے بعد جنون بن کر مظلوم قوم کو بھی اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس ظالم قوم کی غلامی کا جوا اپنی گردن

سے آثار بھی کے مظلومیت بذات خود ایک ایسا نفسیاتی احساس ہے جو سارے مظلوموں کے درمیان اشتراک عمل پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اور ایک ایجابی قوت وطاقت نہ سہی مگر انسانوں کے اندر مدافعت کی ہمت تعمیر و پیدا کرتا ہے۔ ایشیا کی بے شمار قومیں جو پچھلے چند سالوں میں یورپین استعمار کے چنگل سے یکے بعد دیگرے آزاد ہوئی ہیں اُن کی آزادی میں اگرچہ کسی حد تک عمل دخل دوسری جنگ عظیم کا بھی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی اقوام کے جارحانہ اقدام نے ہی مشرقی قوموں کے اندر آزادی کی تحریکات کو تیز کیا اور انہوں نے اپنے ممالک کو غیروں کی دستبرد سے بچانے کے لیے انتھک اور زبردست جد وجہد کی کہ مغربی استعمار قوت وطاقت کے باوجود پسپا ہونے پر مجبور ہوا۔

مغربی استعماریت کچھ تو اپنے سابقہ تجربات کی بنا پر جو انتہائی تلخ تھے اور کچھ حالات کے دباؤ سے اپنی ظاہری شکل وصورت تبدیل کرنے پر مجبور ہوئی ہے۔ اب اس نے بالکل ایک نئے انداز سے مشرقی قوموں میں نفوذ کرنا شروع کیا ہے۔ دو سو سال کے واقعات نے ان قوموں پر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ دنیا کی کسی قوم کو قوت وطاقت کے بل بوتے پر زیادہ دیر تک غلام نہیں رکھا جا سکتا۔ اس قسم کا جارحانہ طرزِ عمل لازمی طور پر ایک شدید رد عمل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جو بالآخر مظلوم قوم کو ظالموں کے پنجہ سے رہائی دلاتا ہے۔ پھر چونکہ یہ سارے مرحلے کشمکش اور لڑائی جھگڑے سے طے پاتے ہیں اس لیے ان کی تلخیاں بڑی حد تک انسانی حافظوں میں محفوظ رہتی ہیں اور غلامی کے جال سے نکلنے والی قوم کا ہر حساس اور ہوشمند فرد ایک مدت دراز تک اس ظالم قوم کے افعال و اعمال کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اُس کے اخلاص، اُس کی سوز مندی اور ہمدردی پر اُسے قطعاً اعتبار نہیں آتا اور وہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اُس کے اثر ونفوذ کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے ہر قدم پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے اب مغربی قومیں اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کے لیے ایسے مہذب ذرائع استعمال کرنے لگی ہیں جن میں اس قسم کی تلخ صورتِ حال پیدا

نہیں ہونے پاتی بلکہ کمزور قومیں بڑی ہنسی خوشی اپنے سارے اسباب و وسائل ان استعماری طاقتوں کے قدموں میں لا ڈالتی ہیں۔

اس تبدیلی کی دوسری وجہ سائنس کی ایجادات و انکشافات ہیں۔ زمان و مکان پر انسان کی فتح نے ملکی اور جغرافیائی حدبندیوں کو بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ نظری حیثیت سے اگر دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ قومیت کا تعلق اب خاک وطن سے کہیں زیادہ سیاسی گروہ بندیوں سے ہے۔ اس تصور کی بدولت جو اگرچہ سراسر مادی ہے، قومیت کا دائرہ وسیع ہوا ہے اور دنیا کی پوری آبادی مختلف تہذیبی اور ثقافتی منطقوں میں بٹ گئی ہے۔ ان منطقوں میں شامل ہونے والی قومیں اپنی نسلی اور لسانی انفرادیت کو تو کسی حد تک برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہیں مگر ان میں سیاسی اور معاشی تعاون عمل کی ایسی صورتیں نکالی جاتی ہیں کہ کمزور اقوام خود آگے بڑھ کر اپنے آپ کو طاقتور قوموں کے حوالے کر دیتی ہیں۔ پہلے جو کچھ طاقتور گروہ لڑائی جھگڑے اور ظلم و زیادتی سے حاصل کرتے تھے اب وہ سب کچھ محبت، دوستی، رفاقت کے پردے میں کیا جاتا ہے۔ دنیا کی کمزور قومیں ان نئی استعماری طاقتوں کے ہاتھوں بالکل تباہ و برباد ہو جاتی ہیں مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی

اس استعمار کا دائرۂ عمل بھی پہلے استعمار سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ یہ جب کسی قوم میں راہ پاتا ہے تو اپنی ساری توجہ معاشی لوٹ کھسوٹ پر ہی صرف نہیں کرتا بلکہ اس قوم کے اخلاق، اس کے مذہب، اس کی معاشرتی روایات، اُس کے ادب، اُس کی تہذیب و ثقافت سب پر دستِ تظلم دراز کرتا ہے۔ اس کا یہ طرزِ عمل بالکل فطری اور ناگزیر ہے۔ ایک قوم جو وطنی اور جغرافیائی حدود سے نکل کر ایک مخصوص تہذیب و تمدن کو اپنی قومیت کی اساس بناتی ہے۔ اس کو تباہ و برباد کرنے کی ممکن العمل صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ جن تہذیبی اور معاشرتی روایات نے اُسے ایک الگ قومی وجود بخشا ہے، انہیں یا تو بالکل نیست و نابود کر دیا جائے یا انہیں اتنا کمزور بنا دیا جائے کہ ان میں لوگوں کو ایک

مخصوص اجتماعی سانچے میں ڈھالنے کی قوت و طاقت باقی نہ رہے۔ دنیا کی جو طاقتور قوم بھی اس مقصد کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرے گی، انسانوں کی سربراہی اور امامت اُسی کے ہاتھ میں ہو گی۔ چنانچہ دیکھیے کہ مغرب کے مختلف سیاسی بلاک اس کام کی تکمیل کے لیے کتنی بے جگری سے کوشش کر رہے ہیں۔ یہ لوگ ایک لمبے تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ طیاروں کے ذریعہ بم برسانے سے قومیں ختم نہیں ہوتیں زہریلی ہواؤں کی مدد سے قوموں کی بصارت تو زائل کی جاسکتی ہے لیکن ان کی بصیرت زائل نہیں ہونے پاتی اس لیے انہیں برباد کرنے کا سب سے موثر ذریعہ یہی ہے کہ جن سہاروں سے ان کا قومی تشخص برقرار رہتا ہے ان کو ختم کرنے کی فکر کی جائے۔

مسلمان قومیں جو اس استعمار کی سب سے بڑی شکارگاہیں ہیں، وہاں ذرا دیکھیے، کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ کن کن عیاریوں اور چالبازیوں سے ان کی آئیڈیالوجی مٹائی جا رہی ہے۔ ان کے تہذیب و تمدن، اُن کی معاشرتی اور سیاسی روایات کو نیست و نابود کرنے کے لیے کس قسم کے "مہذبانہ" ہتھکنڈے استعمال ہو رہے ہیں۔ استعمار کی ان ریشہ دوانیوں کی داستان پہلی داستانوں سے کچھ کم دلفگار اور زہرہ گداز نہیں۔ البتہ ان میں صرف ایک فرق ضرور دکھائی دیتا ہے۔ پہلے استعمار نے اس قوم کے مال و متاع پر ہاتھ صاف کیا، اس کے ذہین اور عقلمند افراد کو یا تو قتل کیا یا پھر قید و بند میں ڈال دیا۔ لیکن اس نئے استعمار نے اب بدقسمتی سے اس کی سب سے قیمتی متاع یعنی دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنا شروع کیا ہے۔ کیونکہ یہ اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ اس قوم کا دین ہی اس کی زندگی کا مبداء اور اس کی اساس ہے اور اگر اسے برباد کر دیا جائے تو پھر اس قوم کی حیثیت اس دنیا میں ایک "زندہ لاش" سے زیادہ کچھ بھی نہ ہو گی۔ اس دین سے یہ ملت نہ صرف زندگی کی حرارت حاصل کرتی ہے بلکہ اس کے اندر ہر قسم کی جارحیت کے خلاف مدافعت کا جو جذبہ ابھرتا رہتا ہے وہ بھی اسی ایمان کی کرشمہ سازی ہے۔ دین ہی اس کی سب سے بڑی قوت ہے اور اگر اس سے اس کا رشتہ منقطع ہو جائے تو پھر اس کے اندر کوئی طاقت بھی باقی نہیں رہتی۔

اس "بلند و بالا مقصد" کے حصول کے لیے جس قسم کی چالبازیوں سے کام لیا جا رہا ہے وہ اس استعمار کے خوفناک عزائم کی پوری طرح غمازی کر رہی ہیں۔

اس سلسلہ کی پہلی کوشش یہ ہے کہ اس قوم کے ذہین نوجوانوں کو "دین الحاد" قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے کیونکہ اگر ایک دفعہ یہ "فریب خوردہ شاہین" جال میں آ گئے تو پھر اس استعمار کے سامنے کوئی چیز بھی ٹھہرنے نہ پائے گی۔

اس نصب العین تک پہنچنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ بڑا ہی مؤثر اور نتیجہ خیز ہے یعنی اب اس قوم کی نوخیز نسلوں کو یہ نہیں کہا جاتا کہ تم اور تمہارے آباو اجداد جس دین پر ایمان رکھتے ہیں وہ غلط ہے اس لیے تمہیں اسے ترک کر دینا چاہیے۔ یہ طریقہ تو بڑا پرانا اور غیر سائنٹیفک ہے۔ اس کے برعکس اب جو طریقہ ایجاد ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی بڑی ہی مدح و ستائش کی جاتی ہے اور خصوصاً اس کے اُن حصوں سے بڑی ہی عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے جو بظاہر مغربی نظام تمدن میں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر جمہوریت، مساوات اور حریتِ عقل۔ اس قسم کی مشترک بنیادوں کا فراہم کر لینا استعمار کی پہلی کامیابی ہے۔ یہ بنیادیں حجاب اور مغائرت کے اُن سارے پردوں کو چاک کر دیتی ہے جو دو ادیان کے ماننے والوں کے درمیان افکار و جذبات کا اختلاف حائل کرتا ہے۔ وہ ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے کو قبول کر لینے میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے بلکہ "ارتداد" کا یہ دشوار گزار مرحلہ بڑی ہی آسانی اور بے تکلفی سے طے ہو جاتا ہے۔ آدمی اسلام جیسی نعمتِ غیر مترقبہ کو چھوڑ کر بڑی ہی خوشی کے ساتھ الحاد جیسی لعنت کا طوق اپنے گلے میں ڈالتا ہے مگر اُسے اس چیز کا قطعاً احساس نہیں ہونے پاتا کہ وہ ایک قعرِ مذلت میں گر رہا ہے۔ وہ اپنی اس حسرتناک تبدیلی کو خدمتِ دین و ایمان ہی سمجھتا رہتا ہے۔

پچھلے چند سالوں میں غیر مسلم مستشرقین نے اس قسم کی جتنی کوششیں کی ہیں اُن کی مثال پوری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ ان کو پڑھ کر انسان قدرتی طور پر یہ سوچنے لگتا ہے کہ آخر اسلام

کی یہ تعلیمات تیرہ سو سال سے مسلمانوں کے ہاں موجود ہیں لیکن وہ آج سے پہلے ان لوگوں کے لئے کیوں وجہ جاذبیت نہیں بنیں اور اب ان میں وہ کونسی غیر معمولی خوبی پیدا ہو گئی ہے جس نے ان کے دل و دماغ کو یک لخت مفتوح کر لیا ہے۔ پھر اسلام اگر ان حضرات کے لیے اتنا ہی باعثِ کشش ہے تو آخر اسلام کے یہ فدائیان اس پر ایمان کیوں نہیں لے آتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام جمہوریت، مساوات اور عقل و فکر کی آزادی کا علمبردار ہے مگر ان تصورات کے پیچھے اُس کا اپنا ایک مخصوص تخیل کام کرتا ہے۔ اُس کی جمہوریت کا قصرِ عوام کی حاکمیت کی بجائے حاکمیت باری تعالیٰ کی بنیاد پر اٹھایا گیا ہے۔ اسی طرح وہ قومی اخوت کی بجائے انسانی اخوت کا قائل ہے۔ اس کے ہاں حریتِ فکر سے بھی مراد یہ نہیں کہ انسان تمام قسم کی بندشوں سے اپنے ذہن کو آزاد کر لے۔ اس کی نظر میں حریتِ فکر کا یہ تصور ابلیس کی ایجاد ہے وہ عقل و خرد کی جس آزادی کی تلقین کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن کو اُن ساری جکڑبندیوں سے آزاد کرے جن میں غیر اللہ کی اطاعت نے اُسے جکڑ رکھا ہے اور اپنے آپ کو صرف خدا کی اطاعت میں دے دے۔

ہمیں یہ ماننے میں سخت تامّل ہے کہ ان مشترک بنیادوں کے نیچے چھپے جو نظریاتی اختلاف کام کر رہا ہے اہلِ مغرب کا پڑھا لکھا طبقہ اُس سے ناواقف ہے۔ جن لوگوں نے عمر بھر کی محنتِ شاقہ کے بعد ان بنیادوں کو فراہم کیا ہے وہ ان بنیادی حقائق سے کس طرح ناآشنا رہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان بنیادوں کو اس لیے ابھار ابھار کر سامنے لایا جاتا ہے کہ یہ وہ موزوں پوائنٹس (POINTS) ہیں جن پر سے امتِ مسلمہ کی فکر کی گاڑی کو الحاد و دہریت کی لائنوں پر منتقل کر دینا بہت سہل اور آسان ہے۔

عملی طور پر بھی اس دین سے مسلمانوں کو برگشتہ کرنے کے لیے بیشمار طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔ شریعتِ اسلامی کے مجموعی ڈھانچے میں سے نہایت عیاری کے ساتھ چند ایسی چیزوں کو منتخب کر لیا

جاتا ہے جو جدید تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ رواج کے خلاف پڑتی ہیں اور انہیں موضوعِ سخن بنا کر مسلمانوں کے دماغ کو پراگندہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اندر ان جاہلی تہذیبوں کے لیے محبت کا جذبہ بڑی حکمت و دانائی سے ابھارا جا رہا ہے تاکہ یہ لوگ اسلام کی بجائے ان تہذیبوں کو اپنائیں جو اسلامی انقلاب سے پہلے مختلف اقوام میں رائج تھیں۔ اس کے علاوہ ان افراد، اداروں اور تنظیموں کی بھی پوری طرح پشت پناہی ہوتی ہے جو دین اور دینی اقدار کو ختم کرنے کا موثر ذریعہ ثابت ہوں۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری لاتعداد تدابیر کچھ ایسی نہیں جن سے ملتِ اسلامیہ ناواقف ہو۔ ہمارے ہاں کا ہر سوچنے اور سمجھنے والا فرد ان کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ استعمار بڑی سرعت کے ساتھ ہمارے رگ و پے میں سرایت کر رہا ہے، مگر ہم ہیں کہ اس کی یلغار کو بڑے اطمینان کے ساتھ دیکھتے چلے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہم تو خود آگے بڑھ کر اس کا استقبال کر رہے ہیں۔ یہی چیز اس کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس نے ہمارے فکر و نگاہ کو اس حد تک بدل دیا ہے کہ ہم میں نہ صرف احساسِ زیاں باقی نہیں رہا بلکہ اس زیاں کو ہم اپنے حق میں انتہائی مفید اور کارآمد سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ آثار ہماری تباہی و بربادی کی سب سے بڑی علامت ہیں۔ جن کے نمودار ہونے پر ہماری نیندیں حرام ہو جانی چاہییں۔ اگر ہم اپنے آپ کو اور اپنی ملت کو اس استعمار کی یورش سے بچانے کے متمنی ہیں تو پھر اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ہم اپنے دین و ایمان کو بچانے کی فکر کریں جس پر نہ صرف ہماری اخروی نجات کا دارومدار ہے بلکہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا انحصار بھی ہے یہ دین ہی ہماری کامیابی کی واحد ضمانت ہے خواہ وہ آخرت کی کامیابی ہو یا اس دنیا کی۔

شب برات

شب برات کو عموماً مسلمانوں کا ایک تہوار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے کچھ مراسم بھی مقرر کر لیے گئے ہیں جن کی شدت سے پابندی کی جاتی ہے۔ دھوم دھام کے لحاظ سے تو گویا محرم کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ خواہ مخواہ کا بناوٹی تہوار ہے۔ نہ قرآن میں اس کی کوئی اصلیت ہے، نہ حدیث میں۔ نہ صحابۂ کرام کے دور کی تاریخ ہی میں اس کا کوئی پتہ نشان ملتا ہے اور نہ ابتدائی زمانہ کے بزرگانِ دین ہی میں کسی نے اس کو اسلام کا تہوار قرار دیا ہے۔

دراصل اسلام رسموں اور تہواروں کا مذہب ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایک سیدھا اور معقول مذہب ہے جو انسان کو رسموں کی جکڑ بندیوں سے، کھیل تماشے کی بے فائدہ مشغولیتوں سے، اور فضول کاموں میں وقت، محنت اور دولت کی بربادیوں سے بچا کر زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی طرف توجہ دلاتا ہے اور اُن کاموں میں آدمی کو مشغول کرنا چاہتا ہے جو دنیا اور آخرت کی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہوں۔ ایسے مذہب کی فطرت سے یہ بالکل بعید ہے کہ وہ سال میں ایک دن حلوے پکانے اور آتش بازیاں چھوڑنے کے لیے مخصوص کر دے اور آدمی سے کہے کہ تو مستقل طور پر ہر سال اپنی زندگی کے چند قیمتی گھنٹے اور اپنی محنت سے کمائے ہوئے بہت سے روپے ضائع کرتا رہا کر۔ اور اس سے بھی زیادہ بعید یہ ہے کہ وہ کسی ایسی رسم کا انسان کو پابند بنائے جو صرف وقت اور روپیہ ہی برباد نہیں کرتی بلکہ بعض اوقات جانوں کو بھی ضائع کرتی ہے اور گھر تک پھونک ڈالتی ہے۔ اس قسم کی فضولیات کا حکم دینا تو درکنار، اگر ایسی کوئی رسم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہوتی تو یقیناً اس کو حکماً روک دیا جاتا، اور جو ایسی رسمیں اس زمانہ میں موجود تھیں اُن کو رد کر ہی دیا گیا۔

حلوے اور آتش بازی کا معاملہ تو خیر اس قدر کھلا ہوا ہے کہ جو شخص کچھ بھی اسلام کے متعلق جانتا ہے وہ پہلی نظر ہی میں کہہ دیگا کہ ان چیزوں کی پابندی اس مذہب کی روح کے خلاف ہے مگر جب ہم تلاش کرتے ہیں کہ شعبان کے مہینہ میں اس خاص دن کے ساتھ کوئی مستند مذہبی عقیدہ وابستہ ہے یا کوئی لازمی عبادت مقرر ہے تو ہم کو اس کا بھی کوئی نشان نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی چیز اسلامی لٹریچر میں ملتی ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ شعبان کی پندرھویں شب کو حضرت عائشہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہ پایا اور وہ آپ کو تلاش کرنے کے لیے نکلیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے بقیع کے قبرستان پہنچیں۔ وہاں آپ کو موجود پایا۔ وجہ دریافت کرنے پر آنحضرت نے فرمایا کہ اس رات کو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف توجہ فرماتا ہے اور قبیلۂ کلب کی بھیڑوں کے جس قدر بال ہیں اُس قدر انسانوں کے گناہ معاف کرتا ہے۔ لیکن حدیث کے مشہور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے اور اپنی تحقیق یہ بیان کی ہے کہ اس کی سند صحیح طور پر حضرت عائشہ تک نہیں پہنچتی۔ بعض دوسری روایات میں، جو کم درجہ کی کتب حدیث میں ملتی ہیں، اس رات کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اس میں قسمتوں کے فیصلے کیے جاتے ہیں اور پیدائش اور موت کے معاملات طے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ سب روایات ضعیف ہیں۔ ہر ایک کی سندیں کوئی نہ کوئی کمزوری موجود ہے۔ اسی لیے حدیث کی قدیم تر اور زیادہ معتبر کتابوں میں کہیں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ تاہم اگر ان کی کوئی اصلیت تسلیم بھی کر لی جائے تو حد سے حد بس اتنا ہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس رات میں عبادت کرنا اور خدا سے مغفرت کی دعا کرنا ایک اچھا فعل ہے جسے انفرادی طور پر لوگ کریں تو ثواب پائیں گے۔ اس سے بڑھ کر کوئی ایسی چیز ان روایتوں سے ثابت نہیں ہوتی جس سے یہ سمجھا جائے کہ چودھویں تاریخ کو یا پندرھویں شب کو اسلام میں عید قرار دیا گیا ہے یا کوئی اجتماعی عبادت مقرر کی گئی ہے۔

حدیث کی زیادہ معتبر کتابوں سے جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

پر رمضان کی آمد سے پہلے ہی شعبان کے مہینہ میں ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبری جیسے عظیم الشان منصب پر مامور کیا گیا اور قرآن جیسی لازوال کتاب کے نزول کا آغاز ہوا۔ اس وجہ سے نہ صرف رمضان میں آپ غیر معمولی طور پر عبادت فرمایا کرتے تھے بلکہ اس سے پہلے ہی آپ کی لَو خدا سے لگ جاتی تھی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ رمضان کے سوا سال کے باقی گیارہ مہینوں میں صرف شعبان ہی ایسا مہینہ تھا جس میں آپ سب سے زیادہ روزے رکھتے تھے، بلکہ تقریباً پورا مہینہ ہی روزہ رکھتے گزر جاتا تھا لیکن آپ کا یہ طرزِ عمل اپنی ذات کے لیے خاص تھا اور اس گہرے روحانی تعلق کی بنا پر تھا جو نزولِ قرآن کے مہینے سے آپ کو تھا۔ رہے عام مسلمان، تو اُن کو آپ نے ہدایت فرمادی تھی کہ ماہ شعبان کے آخری پندرہ دنوں میں روزے نہ رکھا کریں کیونکہ اس میں یہ اندیشہ تھا کہ اگر عادۃً لوگ اس مہینہ کے آخری دنوں میں روزہ رکھنے لگے تو رفتہ رفتہ یہ ایک لازمی رسم بن جائیگی اور رمضان کے فرض روزوں پر خواہ مخواہ دس پندرہ مزید روزوں کا اضافہ ہو جائے گا، اور اس طرح لوگوں پر وہ بار پڑ جائے گا جو خدا نے ان پر نہیں رکھا ہے۔

اسلام میں خاص طور پر یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ جو کچھ خدا نے اپنے بندوں کے لیے لازم کیا ہے، اس کے سوا کوئی دوسری چیز بندے خود اپنے اوپر لازم نہ کرلیں۔ کوئی خود ساختہ رسم، کوئی مصنوعی قاعدہ، کوئی اجتماعی عمل ایسا نہ ہو جس کی پابندی لوگوں کے لیے فرض کی طرح بن جائے۔ خدا زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اس کے بندوں کی بھلائی کن چیزوں کی پابندی میں ہے اور کس چیز کی کتنی پابندی میں ہے۔ اس کی قائم کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر کے اگر بندے بطورِ خود کچھ رسمیں مقرر کرلیں گے اور فرض کی طرح ان کی پابندی کریں گے تو اپنی زندگی کو آپ تنگ کرلیں گے پچھلی قوموں نے یہی غلطی کی تھی کہ نئی نئی رسمیں ایجاد کر کے اپنے اوپر فرائض اور واجبات کے ردّے پر ردّے چڑھاتی چلی گئیں اور رفتہ رفتہ رسمیات کا ایک ایسا تانا بانا اپنے گرد بُن ڈالا جس کے جال نے آخر کار اُن کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر رکھ دیئے۔ قرآن ان رسموں کو زنجیروں سے

تشبیہ و تمثیل ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا ایک بڑا کام یہ بتاتا ہے کہ ان زنجیروں کو کاٹ پھینکیں جن میں انسان نے اپنے آپ کو خود کس رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت محمدی میں فرائض کا ایک نہایت ہلکا اور سادہ ضابطہ تجویز کر کے باقی تمام رسموں کا خاتمہ کر دیا گیا۔ عید اور بقر عید کے سوا کوئی تہوار نہ رکھا گیا، حج کے سوا کوئی جاترا نہ رکھی گئی، زکوٰۃ کے سوا کسی نذر نیاز یا دان پن کو فرض نہ کیا گیا، اور ہمیشہ کے لیے یہ اصول طے کر دیا گیا کہ انسان کو جس طرح خدائی فرض میں کوئی چیز کم کرنے کا حق نہیں ہے، اسی طرح کوئی چیز بڑھانے کا حق بھی نہیں ہے۔

ابتدائی زمانہ میں جو لوگ شریعت محمدی کی روح کو سمجھتے تھے وہ سختی کے ساتھ اس اصول کے پابند رہے۔ انہوں نے نئی رسمیں ایجاد کرنے سے انتہائی پرہیز کیا اور جو چیز لازمی رسم بنتی نظر آئی اس کی فوراً جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک چیز جس کو نیکی اور ثواب کا کام سمجھ کر ابتدا میں بڑی نیک نیتی کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے وہ رفتہ رفتہ کس طرح سنت، پھر واجب، پھر فرض اور آخر کار فرضوں سے بھی زیادہ اہم بنتی چلی جاتی ہے اور جہالت کی بنا پر لوگ اس نیکی کے ساتھ کس طرح بہت سی برائیاں ملا جلا کر ایک قبیح رسم بنا ڈالتے ہیں، اور اس قسم کی رسمیں جمع ہو کر کس طرح انسانی زندگی کے لیے ایک وبال اور انسانی ترقی کی راہ میں ایک بھاری روک بن جاتی ہیں۔ اس لیے ابتدائی دور کے علماء اور امام اس بات کی سخت احتیاط ملحوظ رکھتے تھے کہ شریعت میں کسی نئی چیز کا اضافہ نہ ہونے پائے۔ ان کا یہ مستقل عقیدہ تھا کہ جو چیز شریعت میں نہیں ہے اسے شرعی حیثیت دینا، یا جس چیز کی شریعت میں جو حیثیت ہے اس سے زیادہ اہمیت اس کو دینا بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ بعد کی صدیوں میں اس طرف سے انتہائی غفلت برتی گئی اور بتدریج مسلمان بھی اپنی خود ساختہ رسموں کے جال میں اسی طرح پھنستے چلے گئے جس طرح دنیا کی دوسری قومیں پھنسی ہوئی تھیں۔ اس خرابی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں جو قومیں اسلام کے دائرے میں داخل ہوئیں ان کو صحیح اسلامی تعلیم و تربیت نہ مل سکی۔ وہ اپنے ساتھ پرانے جاہلیت کے بہت سے خیالات اور بہت سے طور طریقے لیے ہوئے اسلام میں آگئیں۔ ان کو صدہا برس سے رسمیات اور تہواروں

اور میلوں ٹھیلوں اور جاتراؤں کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بغیر ان کے لیے مذہبی زندگی میں گویا کوئی لطف ہی نہ تھا۔ اسلام کی سادہ شریعت کے دائرے میں آکر بجائے اس کے کہ وہ پرانی رسموں کا بوجھ اترنے اور پرانی زنجیروں کے بند کٹنے سے اطمینان محسوس کرتیں، انہیں یہاں آتے ہی یہ فکر لاحق ہو گئی کہ کسی طرح وہی بوجھ پھر اپنے اوپر لادیں جنہیں اسلام نے اتارا تھا اور وہی بیڑیاں پھر پہن لیں جنہیں اسلام نے کاٹا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کچھ تو پرانی جاہلیت کی رسمیں ذرا سی ظاہری صورت بدل کر باقی رکھیں، اور کچھ نئی رسمیں خود ایجاد کیں، یہاں تک کہ اسلام کو بھی ویسا ہی رسموں اور تہواروں کا مذہب بنا کر رکھ دیا جیسے ان کے پرانے مذہب تھے۔ ان نئی رسموں کی ایجاد میں ماشاءاللہ خاصی باریک بینی سے کام لیا گیا۔ قرآن اور حدیث کو اس غرض کے لیے تو نہ چھانا گیا کہ اسلام نے انسانی زندگی کے لیے جو نظام نامہ مرتب کیا ہے اس کے اصول معلوم کیے جاتے، بلکہ ساری چھان بین اس لیے کی گئی کہ کہاں ایک نئی رسم ایجاد کرنے کے لیے یا پرانی جاہلانہ رسموں کو جاری رکھنے کے لیے کوئی بہانہ مل سکتا ہے۔ پھر اگر کسی جگہ ایک بال کی نوک کے برابر بھی کوئی اشارہ مل گیا تو اس پر ایک پہاڑ برابر عمارت تعمیر کر ڈالی گئی۔ لوگ اپنی جگہ خوش ہیں کہ اسلام میں تہواروں اور رسموں کی جو کمی تھی اس کو انہوں نے پورا کر لیا ہے۔ حالانکہ دراصل انہوں نے اپنی جہالت سے وہ ساری بیڑیاں پہن لی ہیں جو اللہ نے اپنے نبی کے ہاتھوں سے کٹوا دی تھیں، اور اپنے آپ کو پھر اس جال میں پھانس لیا ہے جس میں پھنس کر دنیا کی کوئی قوم کبھی نہ ابھر سکی۔

اسلام کی حکمتِ تعلیم و تربیت

چند بنیادی خطوط

(سورۂ لقمان کی روشنی میں)

جناب ابو السلام نعیم صدیقی صاحب

(نظامِ تعلیم کو اپنی ملی ضروریات کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا احساس بڑی سرعت سے اُبھر رہا ہے۔ پاکستان میں ہر سوچنے والا دماغ اس امر کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا جو نظام اس "خطۂ پاک" میں موجود ہے وہ ہمارے قومی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ رائج الوقت نظامِ تعلیم ہماری غلامی کی یادگار ہے اور یہ اُس استعماری ذہن کی کرشمہ سازی ہے جس نے صرف اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے اُسے "غلام آباد" میں پروان چڑھایا۔ اس کے پیشِ نظر نہ تو انسانی عقل و فکر کو ترقی دینا تھا اور نہ ہی نئی نسلوں کے اخلاق سنوارنا۔ بلکہ اس کے سامنے صرف دو مقاصد تھے، ایک تو یہ کہ اس ملک کی نئی نسل کی اس طرح سے تربیت کی جائے کہ وہ رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر فکر و نظر کے لحاظ سے خالص انگریز ہو۔ دوسرے وہ انگریزی سامراج کے استحکام کے لیے بہترین کارکن مہیا کرے۔ اب جبکہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے آزادی عطا کی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ "اسلام کی اس تجربہ گاہ" میں اسلامی نظامِ تعلیم کو رواج دیں۔

کسی نظامِ تعلیم کو ترتیب دینے سے پہلے سب سے ضروری چیز یہ دیکھی جاتی ہے کہ اُس کے پیشِ نظر کونسے مقاصد ہیں۔ انہی مقاصد کی صحیح نشاندہی برادرِ محترم جناب ابو السلام نعیم صدیقی صاحب نے اس بیش قیمت مقالہ میں کی ہے۔ خدا کرے کہ نعیم صاحب کے یہ ارشادات ملک کے تعلیم دانوں سے "خراجِ توجہ" حاصل کر سکیں اور وہ ملک کی

تعلیمی منصوبہ بندی میں قرآن و سنت کو مشعلِ راہ بنائیں ۔۔۔ ادارہ]

پورا قرآن نصیحت ہے، پورا قرآن انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے ہے اور پورے قرآن میں وہ اصول، مقاصد اور خطوطِ کار پھیلے ہوئے ہیں جن پر اسلامی معاشرہ کا نظامِ تعلیم استوار ہونا چاہیے۔ اور پھر نبی اکرمؐ نے مدینہ کی اسلامی ریاست میں قرآن کے منشا کے مطابق بچوں، بالغوں، عورتوں اور قائدینِ عوام کی تعلیم و تربیت کا جو ہمہ گیر نظام عملاً چلایا اور عوام کی ذہنی و اخلاقی تعمیر کے لیے جن اداروں کے نقوشِ اولین قائم کیے، اس پورے کام کو ۔۔۔ قرآن کے نکات کی اس جامع عملی توضیح و تفسیر کو ۔۔۔ زیرِ غور لائے بغیر اسلام کی حکمتِ تعلیم کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس حکمت کے مطابق کوئی تعلیمی منصوبہ عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ قرآن، اسوۂ رسالت اور قرآن کے مطابق برسرِ عمل آنے والے نظام کا تفصیلی و تحقیقی جائزہ لے کر اسلامی حکمتِ تعلیم کو قلمبند کرنے کے لیے تو بڑا وقت درکار ہے۔ فی الوقت پیشِ نظر یہ ہے کہ ہم اسلامی حکمتِ تعلیم کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔

قرآن میں زندگی کے جو حقائق مذکور ہیں وہ ایک طرف تو پورے قرآن میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں اور دوسری طرف بعض خاص مقامات ایسے ملتے ہیں جہاں کسی ایک حقیقت کو اجمال اور جامعیت سے یکجا بیان کر دیا جاتا ہے۔ حکمتِ تعلیم و تربیت کی کاوش میں پڑ کر جب ہم قرآن کھولتے ہیں تو سورۂ لقمٰن ہم سے خصوصی توجہ کا خراج وصول کرتی ہے۔ سورۂ لقمان تمام تر نصیحت ہے اور از اوّل تا آخر حکمتِ تعلیم و تربیت کا آئینہ دار! اسی سورہ کے مطالب پر ہم اپنے تعلیمی تصورات کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ یہ ہمارے فلسفۂ تعلیم کا سورہ ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ گھروں میں ہم اولادوں کو کس نقشے پر اٹھائیں، درس گاہوں کا نظام کن بنیادوں پر کھڑا کریں، اور کس ذہن و کردار کا انسان اپنے ہاں تعمیر کریں۔

اسلام کا انسانِ مطلوب | آئیے سب سے پہلے ہم اس سورہ کے آئینہ میں اسلام کے انسانِ مطلوب کی ایک جھلک دیکھیں۔ سورہ کے دیباچہ ہی میں انسانیت کے اس بہترین کردار کا ذکر موجود ہے جسے ظہور دینے کے لیے الہامی حکمت تقاضا کرتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ کتابِ حکیم کی آیات ہیں

اور ان آیات میں جو ہدایت و رہنمائی ہے اور اس ہدایت و رہنمائی میں جو رحمت مضمر ہے وہ صرف اُن لوگوں کے لیے ہے جو احسان کیش ہوں۔ قرآن کا نظامِ فکر و عمل صرف محسنین کے ذریعے چل سکتا ہے اور یہ نظام اسی طرز کے قائدین و کارکن مانگتا ہے (آیات ۱ تا ۳)۔ ان کے نقشۂ زندگی کے چند اہم آثار بھی بیان کر دیئے کہ :۔

—— وہ نماز قائم کرنے والے ہوں،

—— وہ زکوٰۃ دینے والے ہوں،

—— وہ آخرت کو پیشِ نظر رکھنے والے ہوں۔ (آیت ۴)

بیان کی نوعیت احاطہ و احصار کی نہیں بلکہ مدعا یہ ہے کہ ان ناگزیر اوصاف کے بغیر احسان کیش کردار پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو اپنے رب کے دیئے ہوئے نظامِ ہدایت پر چل سکتے ہیں اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں (آیت ۵)

واضح رہے کہ محسن یا احسان کیش کا مفہوم اسلامی اصطلاح میں یہ ہے کہ آدمی اپنے ہر خیال، عمل اور سرگرمی میں حُسن و خوبی پیدا کرنے کا اہتمام کرے اور اپنی ساری کی ساری زندگی کو حسنِ اعتقاد اور حُسنِ کردار سے آراستہ کرے۔ پھر بات انفرادی اور نجی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہمارا پورے کا پورا تمدنی نظام، اس کے سارے شعبے اور ادارے اور ہماری جملہ اجتماعی سرگرمیاں حسین ترین پیرایہ رکھتی ہوں۔ یعنی اسلام حُسنِ فکر اور حُسنِ عمل کا ایک مکمل نظام مانگتا ہے۔ وہی چیز جسے دوسری جگہ حیاتِ طیبہ کہا گیا ہے۔ ایسے انسانی کردار اور ایسے نظامِ تمدن کے ذریعے ہی انسان کو فلاح حاصل ہوتی ہے۔ زندگی اپنے تقاضوں کو صحیح طور سے پورا کرتی ہے اور انسانیت اپنے فطری مقاصد تک پہنچتی ہے۔ فلاح! — اس دنیا میں بھی اور فلاح آخرت میں بھی۔ اس دنیا میں "حیاتِ طیبہ" کا حصول بجائے خود فلاح کی آخری شکل ہے اور یہی حیاتِ طیبہ اخروی فلاح کی ضامن ہوتی ہے۔

گویا ہمارے نظامِ تعلیم کا منتہا ایسے احسان کیش کرداروں کی تشکیل ہے جو نماز، زکوٰۃ اور

فکر آخرت کے اوصاف کو بنیاد بنا کر حیاتِ طیبہ پیدا کریں اور اپنی ذات سے لے کر بڑے بڑے تمدنی ادارات تک ساری زندگی کو سنوار دیں۔

متقابل کا فاسد کردار قرآن کا اسلوب بالعموم اضداد کو متقابلاً دکھانے کا ہے۔ اب جہاں انسانِ مطلوب کا نقشہ بیان ہوا، وہاں نامطلوب کردار کی بھی ایک جھلک دکھانی لازم تھی مطلوب کردار تو وہ ہے جو مسلک احسان کا متلاشی ہے، جو حیاتِ طیبہ کے حصول کے لیے مضطرب رہتا ہے، جو ہدایتِ رب کو جاننا چاہتا ہے، جو اس کی آیات کی روشنی کا پیاسا ہے جو فلاح کی جستجو میں ہے، اور جس کے سامنے فوری مزے اور چسکے ہی نہیں ہیں بلکہ آخرت کے نتائج بھی ہیں

لیکن متقابل کا کردار وہ ہے جو "لھو الحدیث" کا شائق ہے بے مقصد اور لاحاصل قسم کے قصے کہانیوں سے اسے رغبت ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی حقیقتوں اور اس کے مسائل سے بھاگ کر یاوگی میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ خود پناہ ڈھونڈتا ہو بلکہ وہ تفریحی ادب کے افسوں کو کام میں لاکر دوسروں کو بھی خدا کی راہ سے ہٹا لے جانا چاہتا ہے، درآنحالیکہ اس کے پلّے کچھ بھی علم حقیقت نہیں ہوتا۔ اپنی جہالت کی وجہ سے وہ خدا کی راہ اور خدا کی ہدایت کا مذاق اڑاتا ہے، وہ عظیم اور اٹل حقائق کو تمسخر میں اڑا دینا چاہتا ہے۔ (آیت ۶)۔ اس کے سامنے جب اللہ کی کتابِ حکیم کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ اپنے نشۂ پندار میں بہک کر ان سے اس طرح روگردانی کرتا ہے گویا کہ اس نے کچھ سنا ہی نہیں، گویا کہ اس کے کان بہرے ہیں (آیت ۷)

ہمیں اپنے نظامِ تعلیم کی حکمت متعین کرتے ہوئے خوب صراحت سے طے کر لینا چاہیے کہ ہمیں اپنے ہاں اس طرز کے کردار کو پروان نہیں چڑھنے دینا ہے۔ خصوصاً علوم میں، ادب میں اور فنونِ لطیفہ میں ہمیں ان رجحانات کو نشوونما نہیں دینی ہے جن کا ماحصل لھوالحدیث ہو اور جن کی وجہ سے لھوالحدیث کا ذوق بڑھے۔ وہ تمام فضولیات جو فراریت پسندوں کی پناہ گاہ ہوں، جو راہِ حق سے ہٹانے والی ہوں، جو آیاتِ الٰہی کے لیے کانوں کو بہرہ کر دیں، جو خدا کے سامنے عبدیت کے بجائے استکبار کے مقام پر کھڑا کریں اور جن کی وجہ سے دلوں میں خدائی ہدایت کی تضحیک کا میلان پیدا ہو

عُروۃ الوثقیٰ اپنے محدود علمِ قرآن کی روشنی میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ سورۂ لقمان کی آیت نمبر ۲۲ مرکزی اہمیت رکھتی ہے اور یہی روحِ کلام ہے۔ پڑھیے:

"اور جس نے اللہ کی بارگاہ میں اپنا سرِ تسلیم خم کر دیا اور وہ احسان کیش بن گیا

تو بیں اُس نے ایک مضبوط رشتے کو تھام لیا ۔ ۔ ۔ ۔ الخ"

یہاں پھر "محسن" کی شان سامنے آتی ہے۔ کوئی شخص احسان کیش نہیں ہو سکتا اور زندگی کو حُسن خوبی سے مالا مال نہیں کر سکتا جو اللہ کے وجود کی عظیم صداقت کو نہ تسلیم کرے اور اس کا حاکمانہ مقام پہچان کر اپنی باگ ڈور اس کے حوالے نہ کر دے۔ خدا سے یہ تعلق وہ مضبوط ترین رشتہ ہے جسے تھام لینے کے بعد زندگی تباہ کن ٹھوکروں سے بچ جاتی ہے، خیالات کی آوارگی و پریشانی، جذبات کی بے راہ روی اور اعمال کی بے ربطی کا پوری طرح ازالہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت کے اس مرکزی نقطہ کے گرد فرد کی ساری قوتیں اور تمدن کی جملہ سرگرمیاں منظم و مرتب ہو جاتی ہیں اور نظم و ترتیب کے فقدان میں کوئی حُسن نہیں پیدا ہو سکتا۔

ایک صحیح نظامِ تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ انسانیت کو اس عروۃ الوثقیٰ تک لائے اور خدا پرستی کے رشتۂ محکم کو تھامنے کی صلاحیت دے۔ اسلامی نظامِ تعلیم کی یہ اساسی ذمہ داری ہے کہ وہ بندوں کو خدا کے سامنے سرِ تسلیم پوری طرح خم کر دینا اور خم کیے رکھنا سکھائے۔ یہ حالت اس استکبار کی عین ضد ہے جو آیت ۶ میں بیان ہوا۔

سورہ کی تمہید کے ساتھ مرکزی روحِ کلام کی آئینہ دار آیت کو ملا کر آپ دیکھ چکے۔ آئیے اب اُس مربوط ٹکڑے کو لیں جس میں چند اہم نکات تسلسل سے بیان ہوئے ہیں۔ اس ٹکڑے میں حضرت لقمان اپنے صاحبزادے کو ــــ بلکہ یوں کہیے کہ نئی نسل کو ــــ اساسیات کی تعلیم دیتے ہیں[1]۔ ہم ایک ایک نکتہ کو الگ الگ لیتے ہیں:

[1] اس قدیم بحث کو ہم نہیں چھیڑنا چاہتے کہ حضرت لقمان نبی تھے یا حکیم۔ بہرحال وہ خدا پرست اور صاحبِ ایمان تھے اور انہوں نے بالکل اللہ تعالیٰ کی الہامی ہدایت کے موافق باتیں فرمائیں اور ان باتوں کو قرآن نے

شکر کا مسلک | حضرت لقمان کو جو حکمت اللہ تعالیٰ نے دی تھی اور جس کے تحت وہ اپنے فرزند کو تلقین کرتے ہیں وہ ہے "اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ" (آیت ۱۲) یعنی خدا کا حق پہچانو! احسان شناسی کی روش اختیار کرو۔ اسلام نے خدا کا جو تصور دلایا ہے وہ بنیادی طور سے ایک رحیم شفیق اور وُدود ہستی کا تصور ہے۔ (رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ) اس کا قہر و غضب اس کی صفتِ عدل کی وجہ سے ہے اور اس کی صفتِ عدل خود صفتِ رحمت ہی کی مظہر ہے۔ چنانچہ قرآن کا ایک بڑا حصہ یہی احساس دلانے کے لیے وقف ہے کہ انسان پر خدا کے احسانات و انعامات کس درجہ وسیع ہیں۔ احسان اور رحمت کا حق یہ ہے کہ شکر کا رویہ پیدا ہو۔ ہمارے دین میں تعلق باللہ کی اساس فی الحقیقت جذبۂ شکر پر ہے۔ تقویٰ اور خشیت شکر کے ساتھ ایک لازمی پہلو کی حیثیت سے ہے۔ نعمت اور رحمت کا شعور جہاں شکر کا جذبہ ابھارتا ہے وہاں اس کے چھن جانے کا اندیشہ بیم و خشیت بھی پیدا کرتا ہے۔

بندوں کے شکر کی خدا کو کوئی احتیاج نہیں کہ اس کے بغیر اس کے کام اٹکے جاتے ہوں۔ خدا کے سامنے شکر کی روش کا اختیار کرنا خود ہمارے اپنے احسان کیش بننے اور اپنی زندگیاں سنوارنے کے لیے ضروری ہے۔ جو شخص خدا کے ان گنت احسانات سے استفادہ کرکے اس کی عنایات کا احساس نہیں کرتا، ایسا احسان فراموش زندگی کی صحیح تعمیر کے لیے پھر کوئی بنیاد بھی نہیں پا سکتا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے فرما دیا کہ وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِهٖ (آیت ۱۲) جو کوئی خدا کا حق پہچانے گا اس کا یہ رویۂ احسان شناسی خود اسی کی ذات کے لیے نفع بخش ہے۔ بہر حال محسن بننے کے لیے نقطۂ آغاز جذبۂ شکر ہے۔

شکر کی روش کی ضد کفر ہے۔ واضح کر دیا گیا کہ جو کوئی شکر کی راہ کو چھوڑ کر کفر کی روش اختیار کرے تو اس کا وبال بھی خود اسی کو بھگتنا ہے، اللہ تو غنی و حمید ہے اور اسے نہ کسی کے شکر کی

ص۔ قبولیت دی۔ خدا نے یہ فرما کر ان پر مہرِ توثیق ثبت کر دی کہ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَةَ (آیت ۱۲) حضرت لقمان نے خدا کی سکھائی ہوئی حکمت کے تحت گفتگو فرمائی۔

احتیاج ہے، نہ کسی کے کفر سے کوئی اندیشہ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ ایک ایک فرد کو یہ پیغام دے کہ "اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ"!

انعاماتِ الٰہی کا شعور | شکر کا جذبہ انعامات، احسانات اور عنایات کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سورہ میں یہ شعور دلانے کا اہتمام بھی ہے۔ دعوت دی گئی ہے کہ بے شمار ظاہری اور باطنی نعمتیں تقاضا کرتی ہیں کہ ان پر غور و فکر کرو۔ فرمایا:

—— اس نے زمین و آسمان کو ستونوں کے بغیر کھڑا کیا جیسے کہ تم دیکھتے ہو اور زمین پر ایسے بوجھ جما دیئے کہ تمہیں لیے ہوئے (اپنی گردش میں) کسی طرف ڈھلک نہ جائے اور (اس میں سب طرح کے جانور پھیلا دیئے اور آسمان سے بارش برسانے کا نظم مقرر کیا اور پھر اس کے ذریعے سے نباتات کے نہایت ہی خوب خوب جوڑے ہر طرح کے اگائے۔ (آیت ۱۰)

—— کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ سب کچھ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اسے اللہ نے تمہاری نفع رسانی میں لگا رکھا ہے اور تم پر ظاہری اور باطنی نعمتوں کی بوچھاڑ کر دی ہے۔ (آیت ۲۰)

—— کیا تو نے غور نہیں کیا کہ خدا تعالیٰ رات کو دن میں سے اور دن کو رات میں سے پرو کر نکالتا ہے .... الخ" (آیت ۲۹)

—— کیا تو نے غور نہیں کیا کہ سمندر میں اللہ کی نعمت کے ساتھ کشتی چلتی ہے (آیت ۳۱) .... اور جب اس کے مسافروں کے سروں پر کوئی لہر ایک ابر کی طرح چھا جاتی ہے تو (مصیبت میں گھر کر) وہ اللہ کو پکارتے ہیں —— اس کے لیے جذبۂ عبودیت کو خالص کر کے! .... (آیت ۳۲)

یعنی چاروں طرف سے خدا کی نعمتیں امڈی پڑ رہی ہیں۔ ایک وسیع خوان بچھ رہا ہے۔ قدرت کے اس ماحول میں ایک حقیقت پسند اور حق شناس انسان کے اندر لازماً جذبۂ شکر اُبھرنا چاہیے۔ نظامِ تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ اس ماحول سے اس طرح طلبہ کو روشناس کرائے کہ انہیں خدا کے احسانات و انعامات کا شعور حاصل ہو اور عبدیت کے احساس کے ساتھ ان میں شکر کا جذبہ اُبھرے

ہمیں سائنس، جغرافیہ، تاریخ، ہیئت اور دوسرے تمام مادی و طبعی علوم کی تعلیم اس طرح دینی چاہیے کہ خدا پرستانہ شعور اس میں سمو دیا گیا ہو۔ ہر تجربہ، مشاہدہ، انکشاف، ایجاد و اختراع اور عمل تسخیر ہمارے اندر خدا کے شکر کی اکساہٹ پیدا کرے۔ حضورؐ کا یہ معمول تھا کہ سواری پر بیٹھتے تو جذبۂ شکر کے ساتھ خدا کی حمد کرتے اور اپنے عجز کا اقرار! (سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا . . .) ٹھیک اسی طرح ہمارے سائنس دان جب کسی رازِ فطرت کو سمجھ لیں، ہمارے موجد جب کوئی چیز ایجاد کریں، ہمارے کاریگر جب کسی مشین سے کام لیں اور ہمارے سپاہی جب کسی اسلحہ کو ہاتھ میں لیں تو ان کی روحیں "سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ" پکار اٹھیں۔ اسی خدا پرستانہ جذبۂ شکر کے فقدان نے مغربی تمدن کو مادہ پرستی میں اتنا بہکا دیا ہے کہ قدرت کے عطیات رحمت ہونے کے بجائے عذاب بن گئے ہیں۔ ہمارے نظامِ تعلیم کو اس اندھی مادہ پرستی سے انسانیت کو بچانا ہے۔

لوگوں نے اس طرح کی آیات سے عموماً یہ بات ثابت کرنے کی کوشش تو کی ہے کہ قرآن سائنس اور دوسرے علوم حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ مگر ہمارے جدید طبقے نے یہ کاوش نہیں کی کہ وہ کس اسپرٹ کے ساتھ اور کس نقطۂ نظر کے ساتھ علوم کی تحصیل و اشاعت چاہتا ہے۔ قرآن کا اولین منشا یہ ہے کہ خدا اور اس کی صفات اور اس کے حقوق کی معرفت، اس کے احسانات و عنایات کا شعور اور جذبۂ شکر و سپاس کا سرمایہ مطالعہ انفس و آفاق سے حاصل کیا جائے اور کسی بھی علم کے دائرے میں کوئی قدم آگے بڑھاتے ہوئے ایمان باللہ کو مشعل راہ کی حیثیت دینی چاہیے۔ ورنہ تمام علوم غلط رُخ پر ڈھل جائیں گے اور ان سے جو عمل پیدا ہوگا وہ بھی فاسد ہوگا۔

اوپر جن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے ان کو اور ان کی بے شمار ہم مقصد آیات کو آپ دیکھیے ان سب کا منشا یہ شعور دلانا ہے کہ یہ کائنات اگر کوئی نظم رکھتی ہے، اس کے عناصر اگر تمہارے لیے سازگاری رکھتے ہیں، اس کے قوانین اگر تمہارے لیے تسخیر کی راہیں کھولتے ہیں تو یہ نظامِ فطرت یونہی از خود ایسے نہیں بن گیا، کسی بنانے والے نے حکمت کے ساتھ اسے ایسا بنایا ہے اور تمہیں پیش نظر

رکھا ہے۔ ہمارے علوم کو بھی اسی شعور کی راہ پر جانا چاہیے اور ہمارے نظامِ تعلیم کو بھی یہی مقصد سامنے رکھنا چاہیے۔

اس نکتہ معنی کو ہم آیت ۳۲ میں بہت ہی واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں انسان کے عالمِ نفسیات سے ایک کیفیت پیش کر کے عبرت دلائی گئی ہے۔ انسان جہاں اس کائنات کی وسیع نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ وہاں اس کی مہیب قوتوں کے سامنے وہ اپنے آپ کو انتہائی بے بس بھی پاتا ہے۔ یہ بے بسی اسے ایک ایسے روحانی سہارے کا محتاج بناتی ہے جو تدابیر کی بازی ہر جانے کے بعد بھی قائم رہے۔ سمندر کی موجیں بھی ایک ایسی قوت ہیں کہ جب کبھی انسان ان کی زد پر آتا ہے تو سارے سہارے کھو بیٹھنے کے بعد خدا کی طرف بڑے سچے والہانہ جذبے سے رجوع کرتا ہے۔ آج بھی جب جہاز تباہی کے طوفان میں گھر جاتے ہیں تو جدید الحاد پسند انسان بھی خدا کو یاد کرتا ہے۔ اور بارہا خدا اپنے بے بس بندوں کی دکھ بھری فریادیں سن کر ان کو بچا نکالتا ہے۔ لیکن بچ نکلنے کے بعد کم ہی ہیں جو راہِ حق پر "مقتصد" بن کے چلتے رہیں، بقیہ پھر جحود میں پڑ جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ علم النفس کا ایک باب ہے مگر اپنی ایک خاص غایت کے ساتھ۔ اسی غایت کو سامنے رکھ کر نفسیات کا علم مدوّن کرنے کی، نفسیات کا تعلیمی نقشہ بنانے کی اور نفسیات کا نصاب ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ اس غایت — عبرت اندوزی اور خدا شناسی — کو مقصود بنائے بغیر نفسیات کا علم مدون کرنا یا اس کا سلسلۂ تعلیم و تعلّم جاری رکھنا اسلامی نقطۂ نظر سے قطعاً بے سود بلکہ اُلٹا مضر ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم کی اوّلین غایت خدا اور اس کی صفات اور اس کے حقوق کی معرفت دینا ہے۔ وہ خدا جس کا مقام یہ ہے کہ:

— اللہ ہی ہے جو قیامت (کی گھڑی) کا علم رکھتا ہے۔

— وہی ہے جو مینہ برساتا ہے۔

— وہی ہے جو یہ جانتا ہے کہ رحموں کے پردے میں کیا کچھ ہے۔ (آیت ۳۴)

اور اس کے بالمقابل انسان — عقل کے اس پتلے — کا حال یہ ہے کہ:-

— کسی جان کو نہیں معلوم کہ کل وہ کیا کرے گی۔
— کسی جان کو نہیں معلوم کہ وہ زمین کے کس حصے میں دم توڑے گی۔ (آیت ۳۴)

کائنات اور زندگی کے سارے احوال کا مکمل علم صرف اللہ کو ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۔

یہ ہے وہ مزاج جس سے ہمارے نظامِ تعلیم کو آراستہ ہونا چاہیے۔ اس نقطۂ نظر سے معلومات مرتب ہونی چاہییں اور پھر بعد کی نسلوں کی طرف منتقل ہونی چاہییں۔

کلماتِ الٰہی کا فہم | اسی سورہ میں آتا ہے کہ اگر زمین کے سارے کے سارے درختوں سے ملبتے قلم بنا لیے جائیں اور ساتوں سمندر روشنائی میں بدل لیے جائیں اور لکھنے کے اس سامان کے ساتھ "کلمات اللہ" — یعنی خدا کی نعمتوں، اس کی قدرتوں، اس کی آیتوں، قوانین و نوامیس، اس کے احکام اور فیصلوں، اس کی مخلوقات کے احوال کو قلمبند کیا جانے لگے تو روشنائی کے سمندر ختم ہو جائیں گے اور قلم گھس گھس کر نابود ہو جائیں گے مگر خدا کے کلمات احاطۂ تحریر میں نہ آسکیں گے۔ ذکر تو اس کے مقامِ عظمت، اس کی قدرت کی لامحدود وسعتوں اور اس کی بے پایاں تخلیقات کا ہے لیکن ایک واضح اشارہ یہاں یہ ہے کہ اصل کاوش کا میدان انسان کے لیے یہی ہے کہ وہ کلماتِ الٰہی سے اپنا دامنِ علم و ایمان بھرتا رہے۔ افراد اور قومیں اور نسلیں اپنی محنتیں اس مقصد پر کھپاتی چلی جائیں ؎

"کیا اور جہاں میں رکھا ہے، اُس جانِ جہاں کی بات کریں"

اسلامی نظامِ تعلیم کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے زیرِ اثر ذہنوں میں تحریک پیدا کرے کہ وہ مطالعۂ آفاق و انفس کریں تو اس مقصد سے کریں کہ کلماتِ الٰہی کی جستجو کرنی ہے، اُن کو سمجھنا ہے اور ان سے روشنی اور قوت حاصل کرنی ہے۔

خشیت | ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ شکر دین کا اگر ایک پہلو ہے تو دوسرا لازمی پہلو خشیت ہے۔ احسان کی قدر از خود احسان کے چھن جانے کا اندیشہ پیدا کرتی ہے۔ سو جہاں خدا کی رحمت کے لیے تمنائے بیتاب موجود رہنی چاہیے وہاں رحمت سے محرومی کی فکر بھی کارفرما ہونی چاہیے۔

آدمی رحمتِ الٰہی کے نشے میں پڑ کر بعض اوقات اپنی ذمہ داریاں بھول جاتا ہے اور جب یکایک قہر کی بدلیاں چمکتی دیکھتا ہے تو حواس کھو بیٹھتا ہے وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوسًا۔ پس خشیت کا جذبہ ایک پاسبان جذبہ ہے۔ اور یہ آدمی کو محتاط اور چوکنا رکھتا ہے۔ اسے برسرِ عمل لانے کے لیے آخرت کے محاسبے کا تصور دلایا گیا ہے۔ سورۂ لقمان میں انتباہ دیا گیا ہے کہ:

— معاملات کا آخری فیصلہ اللہ کی بارگاہ میں ہوگا۔ (آیت ۲۲)

— اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اندیشہ رکھو اس دن کا جس دن نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کے لیے کچھ مفید ہو سکے گا۔ یقیناً خدا کا وعدہ سچا ہے، سو تم کو دنیوی زندگی دھوکے میں نہ ڈالنے پائے اور تم کو اللہ کے بارے میں وہ دغاباز (شیطان) کسی فریب میں مبتلا نہ کر دے۔ (آیت ۳۳)

بہت سے مغالطے صاف کرنے کے لیے یہ بھی بتا دیا کہ لاکھوں انسانوں کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنے میں خدا کو کوئی مشکل درپیش نہیں ہے:

— تم سب کو بنانا اور تم سب کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے بس ویسا ہی ہے جیسے کسی ایک فرد کا! (آیت ۲۸)

اور حضرت لقمان بھی اپنے فرزند کو خدا کی مضبوط گرفت سے یوں آگاہ کرتے ہیں کہ:

— اے میرے بیٹے! اگر رائی برابر بھی کوئی چیز کسی پتھر کے اندر ہو یا آسمانوں میں یا زمین میں (کہیں) ہو تو اللہ (جب چاہے) اسے لا حاضر کرے۔ (آیت ۱۶)

اسلامی زندگی خدا کے محاسبے اور خدا کی گرفت کا خوف رکھے بغیر نہیں بنتی۔ اسلام کا انسانِ مطلوب وہی ہے جو محاسبۂ آخرت کو ذہن میں رکھ کر سوچتا، زبان کھولتا اور عملی سرگرمیاں جاری رکھتا ہے۔ وہ ادنیٰ ادنیٰ وقتی مفادات کے بجائے خدا کی رضا جیسا اونچا نتیجہ سامنے رکھتا ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم پر بھی واجب آتا ہے کہ وہ اس خشیت سے دلوں کو آراستہ کرے۔ محاسبۂ

آخرت کا احساس تازہ کرے اور رضائے الٰہی پر نگاہوں کو مرتکز کرا دے حکمت اور نیکی کے لیے یہ خشیت ایک لازمی بنیاد ہے۔

توحید | خدا کے احسانات کے جواب میں شکر اور احسان شناسی کا رویہ صرف توحید کو تسلیم کرنے ہی سے پیدا ہو سکتا ہے ورنہ اگر خدا کے عطیات سے استفادہ کر کے احساسِ شکر پورے کا پورا اس کے حضور پیش کرنے کے بجائے کچھ دوسری مفروضہ ہستیوں پر تقسیم کر دیا جائے تو جن کا حق واجب تھا اس کا حق تو ادا نہ ہوا اور جن کا حق کچھ بھی نہ تھا ان تک بے جا طور پر جا پہنچا۔ حضرت لقمان اپنے فرزند کو تعلیم دیتے ہیں کہ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۚ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ۔ (آیت ۱۳) ظلم کہتے ہیں حق ماری کو۔ یہ خدا کی حق ماری ہے اور اس لیے بہت بڑی حق ماری ہے کہ اُس کا لطف کرکے دوسروں کے گائے جائیں۔

پس اسلامی نظامِ تعلیم کی ذمہ داری ہے کہ وہ نئی نسلوں کو توحید پر جما دے اور ان کو اس سے روکے کہ وہ ذات میں، صفات میں، حقوق میں یا حاکمانہ اقتدار میں خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کریں۔ خدا کا کلی انکار بہ حیثیت مجموعی انسانیت نے شاید کبھی بھی نہیں کیا، نہ آج کا انسان تصورِ خدا سے ذہن کو خالی کر سکا ہے مصیبت یہی رہی ہے کہ کسی نہ کسی نوع کا شرک اولادِ آدم کو لے ڈوبا ہے کسی نے ذات میں شرک کیا، کسی نے صفات میں۔ کسی نے عبادات میں سے دوسروں کو حصہ دیا، کسی نے استعانت دوسری بارگاہوں سے کی اور کسی نے طاعت کے لیے دوسرے اقتدار سامنے رکھ لیے۔ اسلام نے عبادت استعانت اور طاعت کے تینوں پہلوؤں سے انسان کو توحید پر جمایا ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم بھی وہی ہو سکتا ہے جو انسانیت کو یہی درسِ توحید دے۔

سماجی روابط کی درستی | خدا کے احسانات کے شعور سے جس دل میں شکر و سپاس کا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ انسانوں کے احسانات کا بھی بہترین قدردان ثابت ہوتا ہے۔ اور انسانوں میں سب سے بڑھ کر احسان والدین کا ہے اور ان میں سے بھی والدہ کا احسان بہت بڑا ہے۔ چنانچہ حضرت لقمان اپنے بچے کو دوسری نصیحت والدین سے حسن سلوک کی کرتے ہیں۔ وہ خدا کا مطالبہ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"میرا شکر ادا کر اور (میرے بعد) اپنے والدین کا بھی!" (آیت ۱۴)

سماجی رابطوں میں دینِ حق نے والدین کو اوّلین مقام دیا ہے۔ خدا کے عظیم حق کے بعد جو شخص والدین کے حق کو بھی پہچان لیتا ہے، پھر وہ دوسرے تمام رابطوں کے حقوق کا احساس کرنے کے قابل ہو جاتا ہے پھر اس کے کردار میں یہ جذبۂ احسان شناسی اس اصل الاصول کی حیثیت سے پیوست ہو جاتا ہے کہ مجھے ہر بھلائی کا جواب بھلائی سے دینا ہے۔ مجھے جس سے فائدہ اٹھانا ہے اس کو فائدہ پہنچانا بھی ہے جس سے میں کچھ لیتا ہوں اسے دینا بھی ہے۔ گھر، خاندان، معاشرہ اور اس کے ادارات حکومت قوم اور انسانیت سبھی سے آدمی کو بے شمار فائدے پہنچتے ہیں اور اگر وہ احسان شناس ہو تو وہ ہر استفادہ کے جواب میں کوئی نہ کوئی خدمت پیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ والدین کا جس نے حق پہچانا، پھر وہ خاندان اور ذوی القربیٰ اور پڑوسیوں اور افسروں اور ماتحتوں، بلکہ جانوروں تک کے حقوق کا احساس کرنے لگتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے تمام سماجی روابط کی درستی کا دارومدار والدین کا حق پہچاننے پر ہے۔

لیکن والدین کی طاعت و خدمت خدا کی عبادت و اطاعت سے نچلے مرتبہ پر ہے مقدم خدا کا حق ہے خدا کا حق مار کر اگر والدین کا حق ادا کیا جائے تو شرک کی راہ کھل گئی۔ اس وجہ سے یہ وضاحت بھی کی گئی کہ وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا (آیت ۱۵) یعنی اگر والدین تم کو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک بنانے کے لیے مجبور کریں جو تمہارے علم و ایمان میں نہیں ہے تو ایسی صورت میں ان کی غلط بات کی اطاعت نہ کرو۔

یعنی والدین کی اطاعت اور اصولاً انسانی تعلقات کے تمدنی دائرے میں ہر دوسری اطاعت خدا کی اطاعت کی حدوں کے اندر کی جا سکتی ہے ان حدوں کو توڑ کر نہیں۔ جو اطاعت سب سے بڑی اطاعت کی حدوں کو پھاندنا چاہے وہ ترک کر دی جائے گی۔ والدین کے کہنے سے شرک کی روش اختیار نہیں کی جا سکتی، ان کے ایسے حکم سے انکار لازم ہے۔ البتہ اس حالت میں بھی ان کا پاس ادب رہے گا۔ چاہا گیا ہے کہ "وَصَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا" یعنی اس اصولی اختلاف کے باوجود ان سے دنیوی تعلقات خوش اسلوبی سے نبھاؤ۔ یہاں سے ضمناً یہ رہنمائی بھی ملتی ہے کہ سماجی رابطے

— حکمراں سے، والدین اور اقربا سے، کاروباری شرکا سے، دفتری افسروں سے — ایمان و مسلک کے شدید اور واضح اختلافات کے باوجود خوش اسلوبی سے نبھائے جا سکتے ہیں۔ اور ان رابطوں کا قائم رہنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ دعوتِ حق پہنچانے کے دروازے بند نہ ہو جائیں۔

ساتھ ہی پھر تاکید کی کہ "وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ" (آیت ۱۵)۔ زندگی میں پیروی کرو تو صرف ایسے ہی رہنماؤں کی جو خداوند تعالیٰ کی طرف رجوع رکھنے والے ہوں۔ زندگی کے اصول و اقدار انہیں سے لو۔ یہاں اشارہ یہ بھی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں سیاسی اور ذہنی قیادت کے مناصب ایسے افراد کو سونپے جائیں جن کی زندگیاں رجوع الی اللہ کی آئینہ دار ہوں۔ گویا معیارِ انتخاب بھی معین ہو گیا۔ علاوہ ازیں یہ اشارہ بھی یہاں سے اخذ ہوتا ہے کہ ہمیں درسگاہوں کے معلمین بھی ایسے ہی لینے چاہییں جو رجوع الی اللہ کی صفت سے متصف ہوں، کیونکہ طلبہ ان کے اتباع میں چلیں گے۔

اس ہدایت کی روشنی میں ایک اسلامی نظامِ تعلیم کو ان امور کی تربیت دینی چاہیے۔

— خدا کی اطاعت کے تحت سب سے بڑھ کر والدین کی اطاعت، اور پھر درجہ بدرجہ دوسرے تمام روابط کے حقوق کو پورا کرنا۔

— خدا کی اطاعت سے اگر والدین یا کسی دوسرے کا حکم ٹکرائے تو اسے قبول سے انکار کرنا۔

— اعتقاد و مسلک کے اختلاف کے باوجود جائز دنیوی معاملات کی حد تک سماجی رابطوں کو نبھانا۔

— زندگی کے سفر میں صرف ایسے عناصر کی رہنمائی قبول کرنا جو خدا کی طرف رجوع دلانے والے ہوں۔

ان نکات پر ہماری سوکس (CIVICS) کی ترتیب ہونی چاہیے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: حضرت لقمان مزید فرماتے ہیں کہ اے بیٹے:

— نماز قائم کرو

— معروف کا حکم دو اور منکر سے روکو

—— اور اس جدوجہد میں) جو جو کچھ بھی پیش آئے اسے حوصلہ مندی سے برداشت کرو (آیت ۱۷)

اور آخر میں یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ہمت کے کام ہیں - درحقیقت دین کا بہت ہی بڑا تقاضا یہ ہے جو یہاں بیان ہوا ہے - اسلام اپنے انسانِ مطلوب کو اس مقصد کے لیے اٹھانا چاہتا ہے کہ وہ تمدن کے پورے دائرے میں منکر کا سدباب کرے اور معروف کا سکہ چلانے کی جدوجہد کرے - اسے نیکی کا نظام قائم کرنا ہے اور بدی کی جڑ کاٹنی ہے - وہ حق کا سپاہی ہے اور باطل کے خلاف جہاد میں اسے ساری قوتیں کھپانی ہیں - خیالات، نظریات، اخلاق، رسوم، قانون، معاشیات، کاروبار، سیاست بین الاقوامی مسائل کے بے شمار دوائر میں جہاں جہاں بھی اسے قانونِ الٰہی اور فطرتِ انسانی اور عقلِ سلیم کے خلاف کوئی منکر دکھائی دے اس کی ذمہ داری ہے کہ اسے ختم کرنے اور لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرے - دوسری طرف قانونِ الٰہی، بے آمیز فطرتِ انسانی اور عقلِ سلیم جن امور کا تقاضا کرتی ہے ان کو نافذ کرنے کے لیے زور لگائے - اس کا فرض ہے کہ وہ غیر اسلامی نظام اور ماحول میں تبدیلی لائے، انقلاب پیدا کرے -

یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی تبدیلی تکلیف اٹھائے بغیر اور قربانیاں دیئے بغیر اور مزاحمتوں کا سامنا کیے بغیر نہیں لائی جا سکتی - بدی کا زور توڑنے اور نیکی کا راج قائم کرنے کے لیے جو جہاد لازم آتا ہے وہ کوئی کھیل تو ہے نہیں - اس لیے انتباہ دیا گیا ہے کہ اس مہم میں جو جو کچھ مزاحمتیں اور مصیبتیں پیش آئیں ان کو حوصلہ سے سہارو!

ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ کہہ کر توجہ دلائی کہ یہ ہے بلند ہمت لوگوں کے کرنے کا کام! یہ ہے عظیم الشان معرکہ جس کے لیے بازیاں لگائی جانی چاہئیں - یہ ہے نصب العین جس کے لیے جانیں لڑانا مردوں کے شایانِ شان ہو سکتا ہے - نوکری اور کاروبار اور عہدے اور ادنیٰ ادنیٰ خواہشات پر مرتے رہنا اہلِ دل کا کام نہیں -

نماز قائم کرنے کی تلقین یہاں یوں مناسب تھی کہ خدا سے شکر کا تعلق قائم رکھنا تو اس کے بغیر ممکن ہے ہی نہیں، لیکن آگے جو مردانگی مہم سونپی جا رہی ہے اس کا ایک ایک قدم اٹھانے کے لیے نماز سے

مدد لینے کی ضرورت ہے۔ نماز ہی خدا سے تعلق کا ذریعہ ہے اور نماز ہی انسانی دائرہ میں ادائے فرض کے لیے ضروری ہے۔ نماز خدا کے حضور شکر کا اظہار ہے اور بندوں کے مقابلے میں صبر آموز اور ہمت افزا۔

اب یہ بات خود ہی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی تعلیم کو کیا نصب العین سامنے رکھنا چاہیے اور کس مقصد کے لیے نئی نسلوں کو تیار کرنا چاہیے۔ صحیح تعلیم وہ ہے جو ایک طرف بجائے خود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، معروف و منکر کا فہم دلائے اور معروف کو قائم کرنے اور منکر سے روکنے کے جہاد کا انقلابی جذبہ ودیعت کرے۔ پھر ہماری تعلیم گاہوں میں تربیت کا ایسا ماحول ہونا چاہیے جو طلبہ کو اقامتِ صلوٰۃ پر آمادہ کر سکے۔ وہ ان کو صبر و ہمت اور حوصلہ و عزم سے آراستہ کر کے نکالے۔

روشِ کبر سے اجتناب | خدا کے لیے جذبۂ شکر عبودیت کی جس راہ پر لے جاتا ہے اس میں کبر و رعونت کا کوئی مقام نہیں آسکتا۔ مسلکِ شکر اور مسلکِ کبر میں کامل منافات ہے۔ حضرت لقمان بچے کو تاکید کرتے ہیں کہ:

— لوگوں کے مقابلے پر اپنے گال نہ پھلاؤ۔

— اور زمین میں گھمنڈ کی چال نہ چلو

— خدا کسی شیخی باز غلط کار کو پسند نہیں کرتا۔ (آیت ۱۸)

خدا پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی دوسرے انسانوں کے لیے مساویانہ مرتبے کا احساس کرے کیونکہ سب ایک ہی خالق کی مخلوق اور ایک ہی اللہ کے بندے ہیں۔ دوسروں کے مقابلے میں فخر و غرور، اکڑفوں اور ان کی تحقیر کے لیے اسلامی زندگی میں گنجائش نہیں۔ جس شخص میں رتی بھر کبر بھی ہوگا وہ اخروی کامرانی حاصل نہ کر سکے گا اور نہ وہ اس ارضی زندگی میں احسان کیش بن کر حیاتِ طیبہ سے بہرہ مند ہو سکتا ہے۔ غرورِ مال، غرورِ حسن، غرورِ صحت، غرورِ نسل، غرورِ وطن، غرورِ آباء، غرورِ اولاد، غرورِ علم اور غرورِ اقتدار کے تمام دروازے یہاں بند ہیں۔ نہ انفرادی کبر کی رخصت ہے، نہ طبقاتی اور نہ جماعتی فخر کی۔ انسانی معاشرے کے فساد کی شاید سب سے وسیع الاثر بنیاد یہی ہے کہ کوئی فرد، کوئی خاندان، کوئی نسل، کوئی طبقہ یا کوئی جتھا اپنے متعلق یہ سوچتا ہے کہ میں بڑا ہوں اور دوسرے چھوٹے ہیں، میرے

حقوق زیادہ ہیں، میرے مفادات اہم تر ہیں اور مجھے ترجیح حاصل ہے۔ پھر جس کا داؤں چل جاتا ہے وہ اقتدار، قانون، روایات، معاشی تسلط، ذہنی تفوق، طبقاتی بالادستی کے زور سے زندگی کے توازن کو غارت کر دیتا ہے۔ جواباً دوسروں میں بھی ایسا ہی مقام حاصل کرنے کے لیے بے چینی پیدا ہوتی ہے اور پھر رسّہ کشی ہونے لگتی ہے۔

کبر ہی کے تحت ماضی کے کچھ سر پھرے انسانوں نے خدائی کے دعوے کیے، کبر ہی کے تحت چنگیزوں اور ہلاکوؤں نے مدنیت کو پیروں تلے روندا، کبر ہی کے تحت ہٹلر اور مسولینی کی آمریت ابھری اور کبر ہی کے تحت آدمی آدمیوں کے خلاف گھناؤنے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔

اسلام انسانوں کے لیے مساوات کی تعلیم دیتا ہے اور ہماری درسگاہوں کو بھی طلبہ کے اندر یہی روح پھونکنی چاہیے۔ نظام تعلیم نئی نسلوں کو تلقین کرے کہ وہ انسانیت کے سامنے گال پھلاتے اور تیوری چڑھاتے ہوئے نہ آئیں اور زمین پر متکبرانہ روش کے ساتھ زندگی نہ گزاریں۔ ان کو مختال فخور نہیں بننا چاہیے۔

علمِ حق کی مشعل | اس سورۂ تعلیمات میں ایک بیش قیمت نکتہ یہ بھی سکھایا گیا ہے کہ آدمی کو جادۂ ہستی پر ہر قدم علم — یعنی علم حق — کی روشنی میں بڑھانا چاہیے۔ جہالت کی اندھیاریوں میں کوئی قدم نہ رکھنا چاہیے۔

آیت ۶ میں اس فاسد کردار کو بیان کیا جو لہوالحدیث کے ذریعے مسافرانِ حیات کو اللہ کے راستے سے بھٹکاتا ہے اور یہ کارنامہ وہ بغیرِ علم سرانجام دیتا ہے۔

آیت ۱۵ میں حضرت لقمان کی نصیحت میں شرک سے منع کرتے ہوئے "مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ" کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی جب تک تمہیں واضح طور پر علم نہ ہو کہ خدا کا کوئی ساجھی ہے — تم نے دیکھا ہو، یا دلیل قطعی سے جانا ہو، یا الہامی رہنمائی سے معلوم کیا ہو — تو تمہارا یہ کام نہیں کہ محض والدین کے کہنے یا کسی اور کے زور ڈالنے سے ایک نامعلوم بات کو واقعہ تسلیم کر لو۔

آیت ۲۰ میں ایک فاسد کردار کا ذکر ہے جو اللہ کے بارے میں اور اس کے دین کے بارے میں

بغیر کسی علم کے بحثا بحثی کرتے ہیں۔ مختلف دعوے پیش کرتے ہیں، حقیقتوں کی تردید کرتے ہیں۔ ان کو کوئی یقینی ہدایت حاصل نہیں ہوتی اور ان کے پاس کسی ثابت شدہ اور غیر محرف الہامی نوشتے کی سند نہیں ہوتی۔ علم کے بغیر جو لوگ ٹامک ٹوئیے مارنے کے عادی ہو جاتے ہیں ان کو جب اللہ کے نازل کردہ ہدایت نامہ کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس بنیاد پر اسے قبول نہیں کرتے کہ ہم تو اسی روش پر چلیں گے جس پر ہمارے باپ دادا چلتے آتے ہیں۔ ان کی اس جاہلانہ ذہنیت کو خود ان پر نمایاں کرنے کے لیے یہ استفہامی اشارہ فرما دیا کہ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ؟ (آیت ۲۱) — یعنی یہ بھی سوچا ہوتا کہ کیا ہو گا نتیجہ اگر تمہارے باپ دادوں کو یا خود تم کو شیطان جہنم کے عذاب کی طرف لیے جا رہا ہو۔

ان آیات کی مدد سے سمجھا سکتا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ نئی نسلوں کو واضح قسم کے علم حقائق — جو ثابت شدہ الہامی ہدایت پر مبنی ہو یا مشاہدہ و تجربہ کا یقینی حاصل — کی روشنی میں سوچنے اور کلام کرنے اور عملی روش اختیار کرنے کی تربیت دے۔ عالم افکار ہو یا عالم کردار، ہمارے نظام تعلیم کے تربیت یافتہ ضمیر انسان کو علم کی روشنی کے بغیر ظن و تخمین کے اندھیروں میں گامزن نہ ہونے دیں۔ اندھی آباء پرستی اور قوم پرستی اور ہر قسم کی "پرستی" اور چھوٹے تعصبات سے طلبہ کو بچایا جائے۔ وہ بڑی بڑی قوموں، جابر و ظالم حکمرانوں اور غلط ماحول سے متأثر ہو کر حقائق کی راہ سے ہٹ کر کچے قیاسات اور ادھورے نظریات کے سامنے مرعوبانہ اور مقلدانہ شان سے سر خم نہ کریں۔ ان پر حقائق اور نظریات کا فرق واضح ہونا چاہیئے۔ وہ قائل ہو جائیں کہ قیاسی نظریات پر اخلاق، کردار اور تمدن کی بنیاد ہرگز نہیں رکھی جا سکتی۔

تہذیب و شائستگی اوپر کے وسیع نکاتِ حکمت کے ساتھ ساتھ حضرت لقمان اپنے فرزند کو مہذب، صاف ستھرے اور سلیقہ مندانہ اطوار اختیار کرنے کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ وہ سکھاتے ہیں کہ:

— میانہ روی کی چال چلو

— اپنی آواز کو دھیما رکھو — کیونکہ گدھے کی آواز بہت بری آواز ہے (آیت ۱۹)

یعنی چلو تو بہت باوقار طریقے سے چلو۔ نہ یوں کہ آدمی گھبرایا ہوا بھاگ رہا ہو اور نہ یوں کہ مریل طریق سے چل رہا ہو۔ ویسے وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ کا ایک جامع مطلب یہ ہے کہ ہر معاملے میں اعتدال کا رنگ پیدا کرو۔ بولو تو دھیمی آواز سے بولو۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر بولنے سے آدمی جانوروں سے مشابہت اختیار کرتا ہے۔ مزید تفصیلات قرآن میں بھی . . . . . اور حدیث میں بھی بہت بڑے پیمانے پر مذکور ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ اسلامی زندگی چال ڈھال، گفتار رفتار، کھان پان جیسے امور میں اعتدال اور وقار اور سلیقہ و شائستگی کی متقاضی ہے۔ سو ہمارے نظامِ تعلیم کو یہ غایت بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ وہ اچھے آداب و اطوار سے طلبہ کی روزمرہ زندگی کو آراستہ کرے۔ ان کو میانہ روی سکھائے اور انتہاپسندی سے روکے۔

میں نے سورۂ لقمان کو جس طرح سے سمجھا ہے اجمالاً مطالعہ کا ماحصل پیش کر دیا ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سورۃ کے نکات اسلامی نظامِ تعلیم کی بنیادوں، اصولوں اور مقاصد کو بخوبی معین کر دیتے ہیں۔ ان نکات کی شرح و تفصیل کے لیے نہ صرف پورے قرآن سے استفادہ کرنا لازم ہے بلکہ حضورؐ نے عملاً ایک نظامِ تعلیم و تربیت چلا کر قرآن کی جو شرح پیش فرمائی ہے نیز زبان مبارک سے حکمتِ قرآنی کو جس طرح واضح کیا ہے اس سارے کارنامے کی مدد سے کر ہی ہم کسی تعلیمی خاکے میں صحیح رنگ بھر سکتے ہیں۔ مگر بنیادی خاکہ ہمیں سورۂ لقمان میں یک جا ملتا ہے۔

خدا کرے کہ یہ کاوش مبنی بر ہدایت ہو، پڑھنے والوں کے لیے باعثِ افادہ ہو، اللہ کے کچھ بندوں کے سینوں میں اسلامی نظامِ تعلیم کو عملاً پوری طرح کارفرما کرنے کا جذبہ بیدار ہو اور لکھنے والے کے لیے ذریعۂ مغفرت ٹھہرے۔

عہدِ نبوّت کے فقہی اصُول

(ڈاکٹر محمد معروف دوالیبی پروفیسر قانون اسلامی لا کالج شام)

(۲)

آغاز بحث میں ہم نے اصول فقہ کو دو بڑے ادوار میں تقسیم کیا تھا:

- ــ اصول فقہ عہد صحابہ میں
- ــ اصول فقہ عہد صحابہ کے بعد

اس وقت ہماری گفتگو کا محور اصولِ فقہ کا دورِ اوّل ہے لیکن یہ دورِ اوّل بھی ــــ یعنی اصولِ فقہ بعہد صحابہ ــــ دو زمانوں پر مشتمل ہے۔ ایک وہ زمانہ جس میں صحابہ کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی تشریف فرما تھی اور دوسرا وہ زمانہ جو آپؐ کی رحلت کے بعد صحابہ نے گذارا ہے۔ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عینِ حیات تشریع کے جو اصول متداول تھے وہ اُس عہد کے اصول سے (بعض پہلوؤں سے) ممیّز ہیں جو آپؐ کی وفات کے بعد عہدِ صحابہ میں اختیار کیے گئے ہیں اس لیے ہم دورِ اوّل کے فقہی اصول کا مطالعہ اس کے مذکورہ ذیل دو ضمنی زمانوں کے تحت کریں گے:

- اصولِ فقہ بعہد النبیؐ (اس حصہ پر ہم زیر بحث باب میں گفتگو کر رہے ہیں)
- اصولِ فقہ بعد وفات النبیؐ (اس موضوع پر ہم آئندہ باب میں انشاءاللہ روشنی ڈالیں گے)

عہدِ نبوی کے تشریعی مآخذ | نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ تک فقہی و تشریعی نظام کے صرف دو سرچشمے تھے: کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ۔ رہا اجتہاد، تو اس کی جانب بہت نادر حالات میں رجوع کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اجماع کے لیے بھی اس وقت کوئی داعیہ موجود نہ تھا (کیونکہ شارع علیہ السلام خود تعلیم و تفہیم کے لیے موجود تھے)۔

عہدِ نبوت میں قانون کی اصل بنیاد قرآن تھا اور سنّت قرآن کی تشریح و توضیح کرتی تھی۔ اس لیے

وہ قانون کا دوسرا ماخذ تھی) - آیاتِ قرآنی کی تنزیل یا تو ایسے واقعات کے تحت ہوتی تھی جو ہدایتِ الٰہی کے متقاضی ہوتے تھے یا ایسے (تمدنی و اقتصادی) مسائل و قضایا کی مناسبت سے ہوتی تھی (جو وقتاً فوقتاً اسلامی معاشرے میں رونما ہوتے رہتے تھے اور) جن کے بارے میں حکمِ شریعت دریافت کرنے کے لیے لوگوں کے اندر سوالات پیدا ہوتے تھے۔

کیسی بصیرتِ قانون درکار ہے؟ | چونکہ احکامِ قرآنی کی تنزیل جن واقعات یا مسائل کے تحت ہوتی تھی ان کی پوری روداد لوگوں کے علم میں ہوتی تھی اور ان کے اسباب و داعیات سے اور ان کے جملہ پہلوؤں سے وہ علیٰ وجہ البصیرت باخبر ہوتے تھے اس لیے ان واقعات و قضایا کے متعلق نازل ہونے والے احکام ــــ خواہ وہ متعین فرمان کی شکل میں ہوتے یا عمومی کلیات کے لباس یا کسی شرعی اصل کی صورت میں ہوتے تھے ــــ اپنی اصل حقیقت اور ماہیت کے ساتھ ہر سامع کے دل پر اور ہر سائل کے ذہن کی گہرائیوں تک اتر جاتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی بھی ایسے شخص کے لیے جس نے رسول کی صحبت پائی ہوتی تھی اور تنزیلِ قرآن کا زمانہ دیکھا ہوتا تھا احکامِ الٰہی کی "اسپرٹ" اور "منشا" کے فہم میں کسی نوع کے ابہام یا اشتباہ کی گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسی نوعیت کا فہم و ادراک اور اسی طرز کی بصیرت و آگاہی قانون شناسی کی وہ اصل سند اور معیار ہے جس کا بہم پہنچانا ہر اُس قانون داں کے لیے ناگزیر ہوتا ہے جو کسی بھی قانون میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہو۔ بلکہ یہی وہ وصف ہے جو انسانی ذہن و فکر کو قانون کے ظاہری الفاظ کی پرستش سے نجات دلاتا ہے۔ اور خود اجتہاد و استنباط کے لیے بھی عقلِ صحیح اور ذوقِ سلیم کے علاوہ یہ بنیادی کسوٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد بھی صحابہ کے اندر اگر کسی حکمِ الٰہی کے متعلق مزید ہدایت کی طلب ہوتی تھی تو وہ اس حکم کی "اسپرٹ" اور "منشا" کی تشخیص کے لیے نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ صرف اس حکم کی توضیح و تفصیل سے آگاہ ہونے کی خاطر ہوتی تھی۔ اور یہی وہ فرض تھا جو سنت سرانجام دیتی تھی۔

قرآن اور سنت کا باہمی تعلق | چنانچہ جب بھی معاشرے میں نیا مسئلہ یا قضیہ رونما ہوتا ایک نیا

حکمِ الٰہی نازل ہو جاتا اور مجموعۂ قرآن میں ایک نئی آیت کا اضافہ ہو جاتا یا قرآن کے شارح اور مبین ہونے کی حیثیت سے ایک نیا ارشادِ رسول — سنّت — معرضِ ورود میں آجاتا اور مجموعۂ قرآن کے ساتھ مجموعۂ سنّت میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا۔ چونکہ اس عہد میں صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ گرامی ہی مسلمانوں کے لیے واحد مرجع و ہادی تھی، اس لیے آپ کے حینِ حیات ہی آپ کی سنّت تشریعی نظام کا ماخذ ثانی بلکہ قریب قریب آخری (LAST) قرار پاگئی۔

جیسا کہ "سنّت" کے باب میں گزر چکا ہے سنّت فی الجملہ قرآن ہی کے بیان کا نام ہے۔ اور جس طرح قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے واسطہ سے حالات و واقعات کے مطابق نازل ہوتا رہا ہے اسی طرح سنّت بھی آپ ہی کی زبانِ مبارک سے حالات و ضروریات کے تحت وارد ہوتی رہی ہے۔ سنّت اپنی اس حیثیت و منزلت کے ساتھ ۲۲ سال سے زائد عرصہ تک قرآن کے تابع رہی ہے اور قرآن کے تمام مقاصد و اہداف میں بالخصوص احکام و حقوق سے متعلق گوشوں میں شرح و بیان کا فرض بجالاتی رہی ہے۔

سنّت کی تین قسمیں | اس شرح و بیان کے اعتبار سے سنّت کی تین قسمیں سامنے آتی ہیں:

- — یا تو وہ کسی جزئی حکم کو کسی اصلِ قرآنی پر منطبق کرتی ہے
- — یا قرآن کے کسی مجمل اور کلّی حکم کی توضیح کرتی ہے
- — یا وہ قرآن میں واردشدہ جزئی وقائع اور قواعدِ کلّیہ کی روشنی میں کسی نئے قاعدے کو وضع کرتی ہے۔

اب ہم آپ کے سامنے سنّت کی یہ تینوں قسمیں تفصیل کے ساتھ امثال و شواہد کی روشنی میں واضح کرتے ہیں:

پہلی قسم کی مثالیں | اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

— لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (تم آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ)

——— اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ (مگر یہ کہ لین دین ہو، آپس کی رضامندی سے)

اس نصِ قرآنی میں اللہ تعالیٰ نے دو قانونی اصلوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے ہر اصل دوسری اصل کا تتمہ ہے۔ ایک اصل سلبی انداز میں ہے اور دوسری ایجابی صورت میں۔ اوّل الذکر — جو سلبی انداز میں ہے — لوگوں کے لیے باطل اور خلافِ حق طریقوں سے ایک دوسرے کا مال کھانا حرام ٹھہراتی ہے۔ موخرالذکر — جو ایجابی صورت میں ہے — "رضامندانہ معاہدہ" کی شرط لگا کر باہمی لین دین کی اجازت دیتی ہے۔

چنانچہ سنت نے جب دونوں اصلوں سے تعلق رکھنے والے حالات کا جائزہ لیا تو اس نے دیکھا کہ لوگ بعض ایسے عرفی اور رواجی طریقوں کے مطابق لین دین کرتے ہیں جو ان کے اندر ایک مستقل نزاع کا منبع بنے ہوئے ہیں۔ اگرچہ لین دین کے یہ طریقے اپنی ظاہری شکل و صورت کی رو سے قرآن کی قائم کردہ شرعی اصل کے مطابق ہیں یعنی ان میں "رضامندانہ معاہدہ" کا عنصر موجود ہے۔

مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ نے باغات کے مالکوں کو ایک عرفی شکلِ معاملہ پر کاربند پایا اور وہ یہ تھی کہ باغ کے مالک اپنے پھلوں کو ان کی صلاحیت اُجاگر ہونے سے قبل درختوں پر ہی ان کی بیع کر دیتے تھے یعنی مالک خریدار کو درختوں کے اوپر ہی پھل کو اس حال میں دکھا دیتا تھا کہ ابھی وہ خام حالت میں ہوتے تھے۔ اور اسی حالت میں خرید و فروخت ہو جاتی۔ حالانکہ خریدار کے لیے پھل کے اس مرحلے میں یہ معلوم کرنا محال ہوتا تھا کہ اس کی مقدار کتنی ہے اور اس کی نوعیت کیا ہو گی؟ چنانچہ بسا اوقات ناگہانی آفات پھلوں کو نقصان پہنچا دیتیں۔ مثلاً سخت جاڑے کا حملہ ہو جاتا یا کوئی ایسی شجری بیماری لاحق ہو جاتی جو شگوفوں کو ہی چٹ کر جاتی اور خریدار کی نگاہ میں پھل کی متوقع مقدار تمام تر یا اس کا کچھ حصہ ضائع ہو جاتا۔ چنانچہ جب پھل توڑنے کا موسم آتا تو یہ ناگہانی حادثے اکثر و بیشتر مشتری اور بائع کے مابین نزاع برپا کر دیتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ غیر مناسب صورتِ حال دیکھی تو آپ نے اس نوعیت کی بیع کو حرام قرار دیا، اور اس وقت تک درختوں پر لگے ہوئے پھلوں کی خرید و فروخت ممنوع کر دی جب تک پھلوں کی صلاحیت پوری

طرح واضح نہ ہو جائے اور گاہک کو ان کے بخیر و سلامت پختگی تک پہنچ جانے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد قابلِ غور ہے: ارایت اذا منع اللہ الثمرۃ، بم یاخذ احدکم مال اخیہ؟ (تمہارا کیا خیال ہے، اگر اللہ تعالیٰ پھل کو روک لے تو پھر تم لوگ کس حق کی بنا پر اپنے بھائی کا مال — پھل کی قیمت — وصول کرو گے؟)

اس صورتِ معاملہ میں اگرچہ "رضامندانہ معاہدہ" کا عنصر موجود ہے، مگر اس کے باوجود سنت نے اس طریقۂ بیع کو حرام کر دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ معاملہ کی یہ شکل بھی مسلمان بھائی کے مال پر بلا استحقاق دست درازی شمار ہوگی۔ سنت کا یہ بیان تفریعی نوعیت کا ہے یعنی اس میں سنت نے قرآن کی ایک نص پر ایک نئے حکم کی تفریع کی ہے اور اس تفریع یا انطباق کا مدار وہ علتِ تحریم — مال حاصل کرنے کا طریقۂ باطل — ہے جو اصل اور فرع دونوں میں موجود ہے۔

اس قسم کی دوسری مثال بیعِ ملامسہ کی حرمت ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عربوں میں کپڑا فروخت کرنے کا ایک یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ کپڑا تھان کی شکل میں لپٹا ہوتا تھا اور خریدار کے لیے صرف کپڑے کو ہاتھ سے چھو لینا (لمس) کافی سمجھا جاتا تھا۔ یہ لمس خواہ اندھیرے میں ہوتا اور خواہ خریدار کپڑے کی خوبی و ناخوبی کا کچھ اندازہ نہ کر سکا ہوتا، مگر اس کے باوجود معاہدہ بیع ہو جاتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صورتِ بیع کو بھی (اس کی متعدد قباحتوں کے مدِ نظر) مذکورہ نص قرآنی پر تفریع کرتے ہوئے حرام بیوع کی فہرست میں شامل کر دیا۔

تیسری مثال بیع الحبل کی ہے یعنی جانور کے پیٹ ہی میں اس کے بچے کا سودا چکا لینا۔ سنت نے اس بیع کو بھی باطل ٹھہرا دیا۔

دوسری قسم کی مثال بیانِ سنت کی دوسری قسم کی مثال یعنی جب سنت قرآن کے کسی مجمل اور کلی حکم کی تشریح کرتی ہے، فریضۂ زکوٰۃ کی تفصیلات ہیں۔ فریضۂ زکوٰۃ کے ضمن میں سنت نے ابتداً ان تمام اموال کی قسمیں بیان کی ہیں جن پر زکوٰۃ واجب ہے۔ پھر زکوٰۃ کا نصاب اور زکوٰۃ کی شرح بیان کی ہے۔ قرآن نے تو صرف یہ کلی حکم بیان کیا ہے کہ "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ

تُزَکِّیْهِمْ" اس سے آگے قرآن نے یہ ذکر نہیں کیا کہ مال کی وہ کون کونسی قسمیں ہیں جن پر یہ حکم نافذ ہوتا ہے؟ کیا اس حکم میں ہر طرح کا مال از قسم سامانِ تجارت، زرعی پیداوار، اراضی، پارچات اور اثاث البیت وغیرہ شامل ہے یا بعض قسمیں مستثنیٰ ہیں؟ اسی طرح قرآن نے وجوبِ زکوٰۃ کا نصاب بھی واضح نہیں کیا اور اس سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی مقدار پر زکوٰۃ لاگو ہو جائے گی یا کوئی خاص مقدار مقرر ہے جس سے کم پر زکوٰۃ کا قانون نافذ نہیں ہوگا؟ علیٰ ہذا القیاس قرآن زکوٰۃ کی شرح کے بارے میں بھی خاموش ہے — لیکن سنت قرآن کے اس مجمل حکم کی پوری تشریح کر دیتی ہے اور مذکورہ بالا امور سے متعلق تمام ضروری تفصیلات فراہم کر دیتی ہے۔ یہ تفصیلات درحقیقت قرآن کے بیان کردہ قاعدۂ کلیہ کے لیے توضیحی بیانات کا درجہ رکھتی ہیں۔

تیسری قسم کی دو مثالیں بیانِ سنت کی تیسری قسم — یعنی جب سنت قرآن کے اصول عامہ اور احکام جزئیہ کی روشنی میں کسی نئے اصول کو قائم کرتی ہے — کی پہلی مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانِ مبارک ہے کہ: لاضرر و لاضرار فی الاسلام (اسلام میں خود نقصان اٹھانا یا دوسرے کو نقصان پہنچانا درست نہیں ہے)۔ ضرر برداری اور ضرر رسانی کی ممانعت کا مضمون قرآن میں جا بجا بیان کیا گیا ہے۔ کہیں یہ مضمون جزوی احکام و حوادث میں مذکور ہے اور کہیں کلی اور عمومی قاعدوں کے تحت ادا کیا گیا ہے۔ جزوی احکام میں سے ذیل کی دو مثالیں اسی مضمون پر مشتمل ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی عورتوں کے بارے میں جن کو طلاقِ رجعی مل چکی ہو اور وہ اپنی عدت کے ایام مکمل کرنے والی ہوں، ارشاد فرمایا:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ	اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آجائے، تو یا تو بھلے طریقے سے انہیں روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔

یعنی جب ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاقِ رجعی دے دی ہو اور اس کی عدت پوری ہونے والی ہو تو اس کے بعد دو ہی صورتیں ہیں: یا خوشدلی سے اور حسنِ سلوک کی نیت سے رجوع کر لے اور یا

بھلائی کے ساتھ اُسے رخصت کر دے۔ ان دونوں صورتوں کے علاوہ تیسری صورت اختیار کرنے کے بارے میں اس آیت کے ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا:

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا — اور تم عورتوں کو ضرر رسانی کی خاطر نہ روکے رکھو کہ یہ زیادتی ہوگی۔

یعنی اگر رجوع کر لینے سے مقصد محض یہ ہو کہ عورت کو ستایا اور دق کیا جائے اور اسے نقصان پہنچایا جائے تو یہ ممنوع ہے۔

۲۔ مطلقہ عورت کے لیے ایامِ عدت کے دوران سکنیٰ (رہائش) مہیا کرنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

وَأَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ — جہاں تم خود رہتے ہو ان (طلاق شدہ عورتوں) کو بھی اپنے مقدور کے موافق ٹھکانہ دو۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَلَا تُضَارُّوهُنَّ لِتُضَيِّقُوا عَلَيْهِنَّ — اور ان کو تنگ کرنے کی خاطر انہیں ضرر نہ پہنچاؤ۔

یعنی رہائش کے معاملے میں تم مطلقہ عورتوں کو اس نیت سے دق نہ کرو کہ وہ تنگ آکر نکلنے پر مجبور ہو جائیں۔

ان دو مثالوں کے علاوہ بے شمار ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں جزوی احکام کے ضمن میں ضرر اور ضرار کے مضمون کو ادا کیا گیا ہے اور پھر اس سے منع کیا گیا ہے۔

قواعدِ کلیہ کے ضمن میں اس مضمون کی مثالیں بھی متعدد ملتی ہیں۔ مثلاً وہ تمام آیات اسی مفہوم پر مشتمل ہیں جن میں انسانوں کے جان و مال اور عزت و ناموس پر تعدّی کرنے کی نہی کی گئی ہے۔ اور جن میں ظلم و جور اور غضب و جارحیت اور اسی قبیل کے ایسے افعال و اقدامات سے روکا گیا ہے جو ضرر اور ضرار کی تعریف میں آتے ہیں۔ شریعت میں اس مفہوم کے قواعد عمومی انداز میں بکثرت بیان کیے گئے ہیں۔

سنت نے اس مفہوم کو، جو کتاب اللہ میں جابجا کہیں جزوی احکام کے تحت اور کہیں کلی ارشادات کے بطن میں بکھرا ہوا تھا، اخذ کیا اور اس کی مزید تشریح و توضیح کرتے ہوئے اُسے ایک قاعدہ عامّہ کی شکل میں مرتب کر دیا اور وہ قاعدہ عامّہ یہ ہے: لاضرر ولا ضرار فی الاسلام

اجتہاد کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عین حیات ہی قرآن کے بعد اپنی سنت کو فقہ و تشریع کی اصلِ دوم کا درجہ دے دیا تھا۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی قرآن کے بعد سنت کی اہمیت و منزلت اس عظمت کے ساتھ راسخ ہو گئی تھی کہ ان کے نزدیک اجتہاد کی بہت کم گنجائش باقی رہ گئی تھی۔ اس بارے میں ان کا مدارِ عمل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تھا:

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ — پس اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔

لیکن یہ ۲۲ سالہ دور جو سنت نے قرآن کی تشریح و تبیین کی خدمت انجام دینے میں گزارا۔ اس پورے دور میں سنت نے حالات و ضروریات کے مطابق اپنے احکام اور تصریحات کو پیش کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا اُس کی نوعیت ایک مدرسۂ تربیت (TRAINING INSTITUTE) کی تھی۔ اس مدرسۂ تربیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب شریعت کی تعلیم حاصل کر رہے تھے تاکہ آپؐ کے مشن کو آپ کی معیت میں بھی اور آپ کے بعد بھی بوجہ کامل پورا کریں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ آپ گاہے بگاہے پیش آمدہ مقدمات کا فیصلہ صحابہ میں سے کسی ایک کے ذمّے لگا دیتے تھے۔ بلکہ اپنے سامنے یہ کام صحابہ سے لیتے رہتے تھے۔ اسی طرح آپ جزیرۂ عرب کے اطراف و دیار میں لوگوں کو قضاء اور فصلِ خصومات کی ذمہ داریاں دے کر بھیجتے رہتے تھے۔ آپ نے اسی طریق کار نے اجتہاد ـــــ جسے آپ نے قانون سازی کا ماخذ ثالث قرار دیا تھا ـــــ کی طرح ڈال دی۔ چنانچہ جب آپ نے حضرت معاذ بن جبل کو قاضیٔ یمن بنا کر بھیجا تھا تو آپ نے حضرت معاذ کو نصیحت فرمائی تھی کہ مقدمات کے فیصلوں میں پہلے درجہ پر قرآن اور دوسرے درجہ پر سنت کو اختیار کیا جائے اور ان دونوں سے جب کوئی رہنمائی نہ ملے تو اجتہاد اور رائے کو ماخذ قضا بنا لیا جائے

عہدِ نبوت میں اجتہاد محدود پیمانے پر رہا لیکن یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جو لوگ عدل و قضاء کے منصب پر متعین ہو کر ملک کے اطراف و امصار میں جاتے تھے وہ دربارِ نبوت سے بُعدِ مسافت کے باوجود بہر حال جزیرۂ عرب ہی کی حدود میں رہتے تھے اور جس قسم کا ماحول و مقام جوارِ نبوت میں چھوڑ کر آتے تھے اُسی قسم کے ایک دوسرے ماحول و مقام میں پہنچ جاتے تھے۔ جہاں کے اقتصادی و اجتماعی حالات اُسی نہج کے ہوتے تھے جس نہج کے حالات سے وہ پہلے سے واقف ہوتے تھے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان نئے علاقوں میں بھی انہیں زیادہ تر جس نوعیت کے مسائل حوادث سے سابقہ پڑتا تھا وہ ایسے نرالے نہ تھے جن سے وہ قطعاً غیر مانوس ہوتے تھے یا جن کے بارے میں کتاب و سنت کے احکام و ہدایات کی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک ـــ جبکہ ابھی اسلامی حکومت کا دائرہ جزیرۂ عرب تک محدود تھا اور صحابہ کو سرا سر نئے اور اجنبی ماحول سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ فقہ کی اصل ثالث ـــ اجتہاد ـــ نے نمایاں اور قابلِ ذکر رول ادا نہیں کیا تھا بلکہ اس کا چلن گنے چنے قضایا تک محدود رہا۔

عہدِ نبوت تک اجتہاد کا دائرہ کار چونکہ عہدِ نبوت میں اجتہاد بذاتِ خود بھی محدود تھا اور اس کا دائرہ کار بھی محدود تھا اس لیے اس عہد میں ایسے مسائل میں اجتہاد برتنے کا نہیں آیا جو انفرادی اور شخصی حقوق کے دائرہ سے نکل کر اجتماعی اور ملکی حقوق میں داخل ہو جاتے ہیں۔ انفرادی اور شخصی حقوق میں بھی اجتہاد کا استعمال زیادہ تر عقود (معاہدات بیع و شرا اور معاملاتِ نکاح و طلاق وغیرہ) اور التزامات (معاہدات کے شرائط و واجبات وغیرہ) میں جاری رہا ہے۔ اور بہت کم ایسی نوبت آئی ہے کہ عقود و التزامات کے علاوہ بھی دوسرے شخصی مسائل میں اس کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ اس کی صرف ایک مثال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک فیصلے میں ملتی ہے۔ جس زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن کے قاضی تھے تو آپ کی عدالت میں نسب کا ایک قضیہ پیش ہوا جس میں ایک لڑکے کے بارے میں تین آدمیوں میں نزاع برپا تھی اور ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ یہ لڑکا اس کا ہے۔ لیکن اپنے دعوی پر تینوں میں سے ایک بھی ثبوت نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے قرعہ اندازی سے اس مقدمے کا فیصلہ کیا جس شخص کے نام قرعہ نکلا لڑکا اس کے حوالے کر دیا اور باقی دو کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ لڑکے والا ان دونوں میں سے ہر ایک کو ۱/۳ دیت ادا کرے۔

رسائل و مسائل

اہل سنت اور اہلِ تشیع کے بعض اختلافی مسائل

س۔ "مندرجۂ ذیل سوالات کا جواب دے کر مشکور فرما دیں۔ یہ دراصل میرے ایک شیعہ دوست کے اعتراضات ہیں:

۱۔ آیتِ وضو (پارہ ۶۔ رکوع ۶) میں فَاغْسِلُوْا اور وَامْسَحُوْا دو فعل استعمال ہوئے ہیں۔ پہلے سے چہرے اور کہنیوں تک دھونے کا حکم ہے۔ اور دوسرے سے پیروں اور سر کے مسح کرنے کا حکم ہے۔ سمجھانا یہ مقصود ہے کہ اہلِ سنت پیر دھوتے ہیں۔ پیروں کا مسح کیوں نہیں کرتے؟ یہ بات کہاں سے ظاہر ہوتی ہے کہ پیر وضو کے آخر میں دھوئے جائیں۔ جواب مفصل اور واضح ہونا چاہیے۔

۲۔ آیۂ تطہیر میں حضرت علیؓ شامل ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو فدک کی جائداد مانگتے وقت وہ حق پر تھے یا نہیں؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آیۂ تطہیر میں شامل ہونے کی وجہ سے حضرت علیؓ کی طرف سے کسی وقت بھی ایسی بات یعنی مطالبۂ فدک کا گمان نہیں ہو سکتا۔ وضاحتاً دو صورتیں پیدا ہیں۔ ایک فدک کا مانگنا، دوسرے فدک نہ دیا جانا۔ ایسی صورت میں صرف ایک ہی چیز درست ہو سکتی ہے۔ یا تو مانگنا۔ یا نہ دیا جانا۔ اس میں سے کونسی چیز صحیح ہے۔ ترجمان القرآن بابت ماہ نومبر ۵۸ء میں حضرت علیؓ کی طرف آپ نے یہ کس جگہ اشارہ کیا ہے کہ حضرت علی کو علم تھا کہ رسولؐ کی میراث نہیں ہوتی۔ پھر بھی انہوں نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کا مطالبہ کیا۔ یہ کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟

۳۔ جب معاملۂ خلافت پہلی مرتبہ حضرت ابوبکرؓ کے حق میں مسجدِ نبوی میں طے ہوا تو کیا اس وقت حضرت علیؓ موجود تھے؟ اگر نہیں تو اُن کو بلایا گیا یا نہیں؟ کیا کبھی حضرت علیؓ نے

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی ؟ اور کس وقت ؟ یہ بھی لکھیے کہ حضرت علی کو کیوں نہ بلایا گیا ؟

جواب: آیتِ وضو (سورۂ مائدہ، رکوع دوم) کے متعلق شیعوں اور سُنّیوں کے درمیان یہ اختلاف بہت پُرانا ہے کہ آیا اس میں پاؤں دھونے کا حکم دیا گیا ہے یا صرف ان پر مسح کرنے کا۔ آپ کے دوست کو یہ غلط فہمی ہے کہ قرآن میں صاف پیروں کے مسح کرنے کا حکم ہے اور اہل السنت نے محض حدیث کی بنیاد پر دھونے کا مسلک اختیار کر لیا ہے۔ اگر صاف حکم یہی موجود ہوتا تو پھر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف عمل کرتا۔ اصل مختلف فیہ سوال تو یہی ہے کہ قرآن فی الواقع ان دونوں فعلوں میں سے کس کا حکم دیتا ہے اور اس کا حقیقی منشا کیا ہے۔

آیت کے الفاظ یہ ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم اٹھو نماز کے لیے تو دھوؤ اپنے منہ اور اپنے ہاتھ

إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ۔

کہنیوں تک اور مسح کرو اپنے سروں پر اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک۔

اس میں لفظ وَاَرْجُلَكُمْ کی دو قرأتیں متواتر ہیں۔ نافع، ابن عامر، حفص، کسائی اور یعقوب کی قرأت وَاَرْجُلَكُمْ (بفتح لام) ہے، اور ابن کثیر، حمزہ، ابوعمرو اور عاصم کی قرأت وَاَرْجُلِكُمْ (بکسر لام)۔ ان میں سے کسی قرأت کی حیثیت بھی یہ نہیں ہے کہ بعد میں کسی وقت بیٹھ کر نحویوں نے اپنے اپنے فہم اور منشا کے مطابق الفاظِ قرآنی پر خود اعراب لگا دیے ہوں، بلکہ یہ دونوں قرأتیں متواتر طریقے سے منقول ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلی قرأت اختیار کی جائے تو وَاَرْجُلَكُمْ کا تعلق فَاغْسِلُوا کے حکم سے جُڑتا ہے اور معنی یہ ہو جاتے ہیں: "اور دھوؤ اپنے پاؤں ٹخنوں تک۔" اور اگر دوسری قرأت قبول کی جائے تو اس کا تعلق وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ سے قائم ہوتا ہے اور معنی یہ نکلتے ہیں: "اور مسح کرو اپنے پاؤں پر ٹخنوں تک۔"

یہ صریح اختلاف ہے جو ان دو معروف و مشہور اور متواتر قرأتوں کی وجہ سے آیت کے معنی

ہیں واقع ہو جاتا ہے۔ اس تعارض کو رفع کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں قرأتوں کو کسی ایک ہی مفہوم (غسل یا مسح) پر محمول کیا جائے۔ لیکن اس کی جتنی کوششیں بھی کی گئی ہیں وہ ہمیں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچاتیں، کیونکہ جتنے وزنی دلائل کے ساتھ ان کو غسل پر محمول کیا جا سکتا ہے قریب قریب اتنے ہی وزنی دلائل مسح پر محمول کرنے کے حق میں بھی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ محض قواعد زبان کی بنا پر ان میں سے کسی ایک معنی کو ترجیح دی جائے۔ لیکن یہ صورت بھی مفید مطلب نہیں، کیونکہ دلائل ترجیح دونوں پہلوؤں میں قریب قریب برابر ہیں۔ اب آخر اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عمل کو دیکھا جائے۔

ظاہر ہے کہ وضو کا حکم کہیں خلا میں تو نہیں دیا گیا تھا اور نہ وہ محض قرآن کے مصحف پر لکھا ہوا ہمیں مل گیا ہے۔ یہ تو ایک ایسے فعل کا حکم ہے جو پنجوقتہ نمازوں کے موقعہ پر عمل کرنے کے لیے دیا گیا تھا، حضور خود اس پر ہر روز کئی کئی بار عمل فرماتے تھے اور آپ کے متبعین، مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب روزانہ اس حکم کی تعمیل اُس طریقے پر کرتے تھے جو انہوں نے آنحضور کے قول اور عمل سے سیکھا تھا۔ آخر ہم کیوں نہ یہ دیکھیں کہ قرآن کے اس حکم پر ہزارہا صحابہ نے حضور کو، اور بعد کے بے شمار مسلمانوں نے صحابہؓ کو کس طرح عمل کرتے دیکھا؟ قرآن کے الفاظ سے جو بات واضح نہ ہوتی ہو اسے سمجھنے کے لیے اس ذریعہ سے زیادہ معتبر ذریعہ اور کونسا ہو سکتا ہے۔

اس ذریعۂ علم کی طرف جب ہم رجوع کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ صحابہ کی اتنی کثیر تعداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پاؤں دھونے کے قول اور عمل کو نقل کرتی ہے، اور تابعین کی اس سے بھی زیادہ تعداد صحابہ سے اس کو روایت کرتی ہے کہ اس خبر کی صحت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ درست ہے کہ کچھ تھوڑی سی روایات مسح کے حق میں بھی ہیں، لیکن ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا عمل مسح کا تھا، بلکہ دو تین صحابیوں کی اپنی رائے یہ تھی کہ قرآن صرف مسح کا حکم دیتا ہے۔ نیز ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ اگر وضو سے ہوتے اور پھر نماز کے وقت تجدید وضو کرنا چاہتے تو صرف مسح پر اکتفا کرتے تھے دوسری

طرف متعدد مستند روایات خود اہلِ تشیع کے ہاں ایسی ملتی ہیں جن سے پاؤں دھونے کا حکم اور عمل ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً محمد بن نعمان کی روایت ابو عبداللہ رضی اللہ عنہ سے جس کو کلبی اور ابو جعفر طوسی نے بھی صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ "اگر تم سر کا مسح بھول جاؤ اور پاؤں دھو بیٹھو تو پھر سر پر مسح کرو اور دوبارہ پاؤں دھولو"۔ اسی طرح محمد بن حسن الصفّار حضرت زید بن علی سے، وہ اپنے والد امام زین العابدین سے، وہ اپنے والد امام حسین سے اور وہ اپنے والد سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اُن کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "میں وضو کرنے بیٹھا، سامنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے میں جب پاؤں دھونے لگا تو آپ نے فرمایا اے علی، انگلیوں کے درمیان خلال کر لو"۔ الشریف الرضی نے نہج البلاغہ میں حضرت علیؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی جو کیفیت نقل کی ہے اس میں بھی وہ پاؤں دھونے ہی کا ذکر فرماتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ روایات کا وزن تمام تر غسلِ قدمین کے حق میں ہے اور محض مسح کی تائید بہت ہی کم اور سنداً و معنًی کمزور روایتیں کرتی ہیں۔

اب عقل کے لحاظ سے دیکھیے تو پاؤں دھونے ہی کا عمل زیادہ معقول اور قرآن کے منشا سے قریب تر محسوس ہوتا ہے۔ وضو میں جتنے اعضاء کی صفائی کا حکم دیا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ گندگی اور میل کچیل لگنے کا امکان اگر کسی عضو کو ہے تو وہ پاؤں ہی ہیں۔ اور سب سے کم جس حصہ جسم کے آلودہ ہونے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں وہ سر ہے۔ یہ عجیب بات ہو گی کہ دوسرے سب اعضاء کو تو دھونے کا حکم ہو اور پاؤں مسح کے حکم میں سر کے ساتھ شامل کیے جائیں۔ پھر پاؤں پر مسح اگر وضو کے آخر میں کیا جائے تو لامحالہ گیلے ہاتھ ہی پھیرنے ہوں گے۔ اس صورت میں پاؤں پر جو گرد و غبار یا میل کچیل موجود ہو گا وہ گیلے ہاتھ پھیرنے سے اور بھی زیادہ گندہ ہو جائے گا۔ علاوہ ریں اگر آدمی پاؤں پر صرف مسح کرے تو آیت کے دو محتمل معنوں میں سے ایک (یعنی غسلِ قدمین) لازماً چھوٹ جاتا ہے اور صرف ایک ہی مفہوم کی تعمیل ہوتی ہے۔ لیکن اگر آدمی پاؤں دھوئے بھی اور اچھی طرح ہاتھوں سے مل کر ان کو صاف بھی کر دے تو آیت کے دونوں مفہوموں پر بدرجۂ اتم عمل ہو جاتا ہے، کیونکہ

اس صورت میں غسل اور مسح دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔

البتہ مسح کے حکم پر عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں کیا ہے جبکہ آپ موزے پہنے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ آیت کے دوسرے مفہوم سے بھی مطابقت رکھتا ہے، بکثرت روایاتِ صحیحہ سے بھی ثابت ہے، اور سراسر معقول بھی۔ مگر تعجب ہے کہ شیعہ حضرات اسے نہیں مانتے، حالانکہ یہ ان کے اپنے مسلک سے بھی قریب تر ہے۔

(۲) آیۂ تطہیر میں بلاشبہ حضرت علیؓ شامل ہیں، اور خدانخواستہ کوئی مومن بھی ان کے رِجس (اخلاقی یا اعتقادی گندگی) میں مبتلا ہونے کا قائل نہیں، بلکہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن حضورؐ کی میراث کے اس مقدمے میں آخر رجس اور طہارت کی بحث پیدا ہونے کا کیا محل ہے۔ نیک نیتی کے ساتھ بھی تو ایک حکم کا منشا سمجھنے اور ایک معاملۂ خاص پر اس کو منطبق کرنے میں اُن کے اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے درمیان اختلاف ہو سکتا تھا۔ اس سے لازماً یہی معنی کیوں نکالے جائیں کہ انہوں نے دانستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے میراثِ رسول کا مطالبہ کیا؟

بہرحال اس معاملے میں دو واقعے ناقابلِ انکار ہیں۔ ایک یہ کہ اہلِ بیت کی طرف سے میراث کا مطالبہ ہوا، اور اس مطالبے میں سیدہ فاطمہ، حضرت علیؓ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم تینوں شامل ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب پانچ سال تک حضرت علی رضی اللہ عنہ خود خلیفہ تھے اور حجاز (جہاں حضورؐ کی تمام متروکہ جائداد واقع تھی) پوری طرح ان کے تحتِ اختیار تھا، اس وقت انہوں نے بھی حضورؐ کی میراث تقسیم نہیں کی۔ اب ان دونوں واقعات کی جو توجیہ آپ کے دوست کرنا چاہیں کر لیں۔ ہم اس کی جو توجیہ کرتے ہیں اس میں رجس کے کسی شائبے کی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ ہمارے نزدیک ابتداءً یہ مطالبہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے اٹھا تھا (اور غلط فہمی قطعاً کوئی اخلاقی یا اعتقادی گندگی نہیں ہے)، بعد میں جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے پوری طرح اس معاملے کی حقیقت واضح کر دی تو حضرات اہلِ بیت رضی اللہ عنہم بھی مطمئن ہو گئے، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ حضرت علیؓ اپنے زمانۂ خلافت میں شیخین کے فیصلے کو ناجائز سمجھتے اور پھر بھی اس کو بدل کر حق داروں تک ان کا حق پہنچانے سے احتراز کرتے۔

ہم حضرت علیؓ کو اس سے بالاتر مانتے ہیں کہ وہ ایک چیز کو باطل سمجھتے ہوں اور پھر قصداً اس پر قائم رہیں، اور ایک چیز کو نہ صرف اپنا بلکہ دوسرے حق داروں کا بھی حق جانتے ہوں اور پھر بھی اسے ادا نہ کریں۔ یہ بلاشبہ رجس ہے جس کے ادنیٰ غبار سے بھی ہم اہلِ بیت اطہار کے دامن کو آلودہ نہیں مان سکتے۔

آپ کے دوست کا تیسرا سوال واقعات سے بے خبری پر مبنی ہے۔ معاملۂ خلافت مسجد نبوی میں نہیں بلکہ سقیفۂ بنی ساعدہ میں اس رات طے ہوا تھا جس کی شام کو حضورؐ کا انتقال ہوا۔ اس وقت مہاجرین و انصار میں سے کوئی بھی وہاں بلایا ہوا نہیں گیا تھا۔ دراصل انصار کا ایک بڑا گروہ اس جگہ جمع ہو گیا تھا اور خلافت کے مسئلے کو طے کرنا چاہتا تھا۔ جونہی کہ ان کے اس اجتماع اور ارادے کی اطلاع حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ کو ہوئی وہ فوراً وہاں پہنچ گئے اور ایک فتنۂ عظیم کا دروازہ بند کرنے کے لیے انہوں نے اسی وقت انصار کی اس جماعت کو سمجھا بجھا کر اس مسئلے کا ایک ایسا فیصلہ تسلیم کرا لیا جس میں امت کی خیر تھی۔ وہ وقت آدمی بھیج بھیج کر لوگوں کو گھروں سے بلانے کا نہ تھا۔ اگر یہ تینوں حضرات ذرا سی تاخیر بھی کر گئے ہوتے تو وہاں مسلمانوں کے درمیان ایک بڑی خانہ جنگی کی بنا پڑ گئی ہوتی، جو بعد کے فتنۂ ارتداد میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے مہلک ثابت ہوتی۔ اس حالت میں کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ تجویز لیکر نہیں اٹھ سکتا تھا کہ صاحبو، دو چار روز اس معاملے کو ملتوی رکھو، کل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر ایک کانفرنس کا اعلان کریں گے اور پھر اس میں یہ مسئلہ طے کر لیا جائے گا کہ حضورؐ کا جانشین کون ہو۔ اس طرح کی تجویز پیش کرنے کے معنی یہ ہوتے کہ ایک طرف تو سرکار رسالتمآب کے وفات پا جانے کی خبر عرب کے مختلف حصوں میں اس تصریح کے ساتھ پھیلتی کہ کوئی شخص آپ کی جگہ امت کا کام سنبھالنے کے لیے مقرر نہیں ہوا ہے اور یہ چیز ان عناصر کی ہمتیں کئی گنی زیادہ بڑھا دیتی جو اسلام کے خلاف بغاوت برپا کر دینے کے لیے موقع کے منتظر بیٹھے تھے۔ اور دوسری طرف مجوزہ کانفرنس کے انعقاد سے پہلے انصار کے درمیان یہ رائے پختہ ہو چکی ہوتی کہ خلیفہ یا تو کوئی انصاری ہونا چاہیے۔ یا پھر ایک امیر

انصار میں سے اور ایک مہاجرین میں سے ہونا چاہیے۔ حضرت عمرؓ کی بصیرت اس غلطی کے نتائج کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی اس لیے انہوں نے وہیں اُسی وقت مسئلے کا تصفیہ کرا لینا ضروری سمجھا تاکہ کسی فتنے کو پرورش پانے کا موقع نہ ملے، اور بلا تاخیر اس شخص کی خلافت پر بیعت کرالی جسے تمام عرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ راست کی حیثیت سے جانتا تھا جس کے متعلق دوست اور دشمن سب ہی یہ رائے رکھتے تھے کہ مسلمانوں میں حضورِ اکرم کے بعد اگر دوسرے درجے کی کوئی شخصیت ہے تو اسی کی ہے

دوسرے روز صبح کو مسجد نبوی میں جو اجتماع ہوا وہ بیعتِ عام کے لیے تھا نہ کہ مسئلۂ خلافت کا تصفیہ کرنے کے لیے جیسا کہ آپ کے دوست سمجھ رہے ہیں۔ اُس وقت خلافت کے اُس مسئلے کو جو رات بڑی مشکل سے طے ہوا تھا، از سرِ نو بحث کے لیے کھولنے کے کوئی معنی ہی نہ تھے۔ یہ اگر بحث کے لیے کھل سکتا تھا تو اسی طرح کہ عام مسلمان رات کی قرار داد کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے۔ لیکن جب انہیں اس فیصلے سے مطلع کیا گیا تو سب نے اسے بخوشی قبول کر لیا اور بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ سوال یہ ہے کہ اس قبولِ عام کی صورت میں آخر کیوں اسے نئے سرے سے ایک تصفیہ طلب مسئلہ بنا کر بحث کے لیے سامنے رکھا جاتا؟

اس اجتماع میں کوئی بھی گھر سے نہیں بلایا گیا تھا۔ سارے لوگ دُور دُور سے آکر اس لیے اکٹھے ہوئے تھے کہ حضورؐ کے انتقال کی خبر سن کر لامحالہ انہیں اُسی مسجد نبوی کا رُخ کرنا تھا جس سے متصل حجرۂ عائشہ میں حضورؐ کا جسدِ اطہر آرام فرما تھا۔ آپ کے دوست کے دل میں آخر حضرت علیؓ ہی کے متعلق یہ سوال کیسے پیدا ہوا کہ انہیں وہاں بلایا گیا تھا یا نہیں؟ کیا وہاں اور سب لوگ گھروں سے آدمی بھیج بھیج کر بلوائے گئے تھے؟ اور کیا آپ کے دوست کا خیال یہ ہے کہ حضورؐ کی وفات کے دوسرے ہی روز حضرت علیؓ صبح کی نماز میں بھی شریک نہ ہوئے اور دن بھر اس مقام سے بھی غائب رہے جہاں سرکارؐ کی تجہیز و تکفین اور قبرِ مبارک کی تیاری کا کام ہو رہا تھا؟

آپ کے دوست کا آخری سوال کہ کیا حضرت علی نے کبھی ابوبکر کی بیعت کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ معتبر روایات یہی بتاتی ہیں کہ حضرت ممدوح نے اسی روز سب مسلمانوں کے ساتھ بیعت کی تھی۔ طبری نے

سعید بن زید کے حوالہ سے بیہقی نے ابوسعید خدری کے حوالہ سے اور موسیٰ بن عُقبہ صاحب المغازی نے عبدالرحمٰن بن عوف کے حوالہ سے عمدہ سند کے ساتھ یہ روایات نقل کی ہیں۔ اس کے بعد آنجناب سیدۂ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاسِ خاطر سے چھ مہینے خانہ نشین رہے اور پھر ان کی وفات کے بعد دوبارہ تجدید بیعت کر کے کاروبارِ خلافت میں ویسی ہی دلچسپی لینی شروع کی جیسی ان کے شایانِ شان تھی۔ طبری نے اپنی تاریخ میں اور علامہ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ جب حضرت ابوبکر کی بیعت ہو چکی تو ابوسفیان نے آکر ان سے کہا کہ "یہ کیا غضب ہو گیا؟ قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے کا آدمی کیسے خلیفہ بنا دیا گیا؟ اے علی اگر تم چاہو تو خدا کی قسم میں اس وادی کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں"۔ اس پر انہوں نے جو جواب دیا وہ سننے کے قابل ہے۔ فرمایا "اے ابوسفیان، تم ساری عمر اسلام اور اہلِ اسلام سے دشمنی کرتے رہے، مگر تمہاری دشمنی سے نہ اسلام کا کچھ بگڑ سکا نہ اہلِ اسلام کا۔ ہم ابوبکر کو اس منصب کا اہل سمجھتے ہیں"۔

چھوٹے ہوئے فرائضِ شرعیہ کی قضا کا مسئلہ

سوال: ایک مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے: "وہ قضا نمازیں جلد سے جلد ادا کرنا لازم ہیں۔۔۔
۔۔ جبتک فرض ذمہ پر باقی رہتا ہے کوئی نفل قبول نہیں کیا جاتا"

اس اصول کی عقلی حیثیت کسی دلیل کی محتاج نہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ شریعت ہمارے کسی عقلی اصول کو تسلیم کر کے اس پر اپنے مسائل کی بنیاد رکھے۔ ادھر ہم مسلمانوں کی غالب اکثریت کا یہ حال ہے کہ ہر شخص پر ایک زمانہ تھوڑا یا بہت جاہلیت کا گزر چکا ہے جس میں نہ نماز کا خیال نہ روزے کی پروا، اس لیے قضا نمازوں کے لازم فی الذمہ ہونے سے بہت ہی کم لوگ خالی ہیں۔

اب اس مسئلے سے حسبِ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۔ کیا واقعی جب تک کوئی فرض نماز باقی فی الذمہ ہے نوافل (جن میں سنن رواتب

بھی داخل ہیں) مقبول نہ ہوں گے۔

جو لوگ اس حالت میں (کہ قضا نمازیں ان کے ذمہ باقی ہیں) ہر نماز کے ساتھ سنتیں اور نفلیں پڑھتے ہیں ان کی سنتوں اور نفلوں کا کیا ہوگا کیا وہ ضائع جائیں گی یا قضا نمازوں میں محسوب ہونگی۔

یہ اصول تو عام اور ہمہ گیر ہے یقیناً نمازوں کے ساتھ اس کی خصوصیت کی کوئی وجہ نہیں تو کیا روزوں اور دیگر فرائض شرعیہ میں بھی یہی اصول جاری ہے؟

خصوصیت کے ساتھ زکوٰۃ کے متعلق وضاحت فرمائیں۔ اکثر لوگوں کی یہ حالت ہے کہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے لیکن نفل صدقات دیتے رہتے ہیں مثلاً کبھی کوئی چیز پکوا کر فقراء کو تقسیم کر دی کسی نیک کام میں چندہ دے دیا، سائلوں کو پیسے دے دیئے۔ اسی طرح زمیندار اور کاشتکار حضرات عشر ادا نہیں کرتے لیکن برداشتِ فصل کے موقعہ پر جمع شدہ سائلین کو کچھ دے دیتے ہیں اور سارا سال گداگروں کو ان کے گھر والوں کی طرف سے مٹھی آٹا اور غلہ دیا جاتا رہتا ہے، اس طرح دیتے وقت نہ ان کی نیت عشر اور زکوٰۃ کی ہوتی ہے نہ انہوں نے عشر اور زکوٰۃ کا کوئی حساب کر رکھا ہوتا ہے۔

اس طرح کے اخراجات کی شرعی حیثیت کیا ہوگی کیا وہ سب دیا ولایا ضائع جا رہا ہے یا عنداللہ عشر اور زکوٰۃ میں محسوب ہو رہا ہے؟

اس اصول پر کہ جب تک فرض ذمہ پر باقی رہتا ہے کوئی نفل قبول نہیں کیا جاتا) دلیل کی حیثیت سے جو قولہ تعالیٰ الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ کا ذکر کیا جاتا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے؟ کیا کسی حدیث میں عمل صالح کی تفسیر فرائض اور الکلم الطیب کی نفلی اذکار کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔

جواب: آپ کے تمام سوالات جس وجہ سے پیدا ہوئے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ایک صحیح مسئلہ ذرا غلط طریقے سے بیان کر دیا گیا ہے۔ کسی عمل کا قبول کرنا یا نہ کرنا انسانوں کے اختیار میں

نہیں ہے، خداوند عالم کے اختیار میں ہے۔ اگر کسی کے ذمے فرضوں کی قضا لازم ہو اور فرض کی قضا ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اخلاص کی بنا پر سنن و نوافل بھی ادا کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے اس خلوص کو رد فرما دے، ہاں، اگر فرض کی قضا سے غافل رہ کر یہ کام کرے تو امید نہیں کہ یہ فعل اللہ کے ہاں مقبول ہوگا، کیونکہ فرض کی قضا بمنزلہ قرض ہے، اور فرض ادا کرنے سے غفلت برت کر خیرات کرتے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

البتہ جن لوگوں نے اپنی زندگی میں ایک زمانہ حالتِ جاہلیت میں گزار دیا ہو اور اس میں بے شمار نمازیں چھوڑ دی ہیں ان کے لیے پچھلی قضا بھی ادا کرنا اور سنن و نوافل بھی پڑھنا مشکل ہے۔ اس میں اندیشہ ہے کہ اکثر کسل کی بنا پر وہ قضا ادا کرنے سے رہ جائیں گے۔ اس کے برعکس اس میں بڑی سہولت ہے کہ ہر وقت کی فرض نماز کے ساتھ جتنی سنتیں بالعموم پڑھی جاتی ہیں ان کو سنت کی نیت سے پڑھنے کے بجائے آدمی پچھلے چھوٹے ہوئے فرائض کی قضا کے طور پر پڑھتا رہے یہاں تک کہ اس امر کا گمان غالب ہو جائے کہ پچھلی سب قضائیں ادا ہو چکی ہیں۔ اس طرح آدمی بغیر کسی دقت کے بآسانی اس فرض سے سبکدوش ہو سکتا ہے۔

آپ پڑھی ہوئی نمازوں کے ضائع ہونے یا نہ ہونے کا قصہ چھوڑیں۔ اب جبکہ مسئلہ آپ کو معلوم ہو گیا ہے تو آئندہ تمام سنتیں اور نوافل پچھلے چھوٹے ہوئے فرضوں کی نیت کر کے پڑھنا شروع کر دیں۔

چھوٹی ہوئی نمازوں ہی کی طرح قضا روزوں کا معاملہ بھی ہے۔ جس کے فرض روزے چھوٹ گئے ہوں وہ نفل روزے رکھنے کے بجائے فرض کی نیت سے پچھلی قضا کیوں نہ ادا کرے۔

یہی معاملہ زکوٰۃ کا بھی ہے۔ آپ خود سوچیے، آخر یہ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ جس کے ذمہ فرض زکوٰۃ واجب ہو وہ اسے تو ادا نہ کرے اور یوں خیرات کرتا پھرے۔ آخر کیوں نہیں وہ اسی خیرات کو زکوٰۃ کا حساب لگا کر ادا کرتا۔ ضائع کرنے یا قبول کر لینے کے اختیارات تو اللہ کو ہیں، مگر جو بات ہماری اور آپ کی عقل میں آ جاتی ہے کہ فریضے سے غفلت برت کر نوافل ادا کرنے میں کوئی

معقولیت نہیں ہے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اللہ میاں کی سمجھ میں اتنی بات بھی نہ آئیگی؟ اگر وہ پوچھیں کہ جو کچھ میں نے لازم کیا تھا وہ تو تو نے ادا نہیں کیا اور اپنی خوشی سے یہ سب کچھ دے آیا تو آخر کسی کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔

آپ نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس کے متعلق میرے علم میں کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ الکلم الطیب سے مراد نفلی اذکار اور عمل صالح سے مراد فرائض ہیں۔ جن صاحب نے یہ استدلال پیش کیا ہے، آپ انہی سے دریافت کریں ممکن ہے کہ ان کے علم میں ایسی کوئی حدیث ہو۔ البتہ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر ہے کہ الکلم الطیب سے مراد اللہ کا ذکر ہے اور عمل صالح سے مراد فرائض ہیں۔ اور یہ بھی انہی کی رائے ہے کہ جو فرائض ادا کرے اس کا عمل اس کے ذکر اللہ کو لے کر اوپر صعود کرے گا، مگر جو محض ذکر کرے اور فرائض ادا نہ کرے اس کا ذکر ردّ کر دیا جائے گا۔

مطبُوعات

مذاہب عالم ـــــــ ایک معاشرتی و سیاسی جائزہ	از جناب احمد عبداللہ المسدوسی۔ ناشر: مکتبہ خدامِ ملت کراچی (پاکستان) قیمت بارہ روپے: صفحات ۴۹۶۔

اس ملک میں یوں تو پہلے بھی ٹھوس علمی کام کرنے والے حضرات مسلمانوں میں کچھ بہت زیادہ نہ تھے لیکن تقسیم کے بعد تو اسی کمی کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ مسلمانوں میں علمی ذوق ختم ہو گیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے کام کرنے والوں کو وہ سہولتیں میسر نہیں ہوتیں جو اس نوعیت کے کام کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ ایسی ٹھوس علمی چیزوں کے لیے یہاں کوئی مارکیٹ بھی موجود نہیں۔ یہاں کے پڑھے لکھے عوام گھٹیا لٹریچر کے پڑھنے کے دلدادہ ہیں اور وہ اپنے وقت کو کسی علمی کتاب میں صرف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور متوسط طبقہ میں جو تھوڑے سے حضرات اس کی خواہش رکھتے ہیں وہ بیچارے اپنے اندر اس قسم کی کتابوں کو خریدنے کی استطاعت نہیں پاتے کیونکہ ان پر جتنی محنت اور روپیہ صرف ہوتا ہے وہ لازمی طور پر ان کی قیمت میں اضافہ کا باعث بن جاتا ہے۔ اس بنا پر اصحابِ علم نہایت ٹھوس علمی کاموں کے لیے جرأت نہیں کرتے۔

مگر اسے کیا کہیے کہ دنیا میں عشق و جنون، ایسے محرکات ہیں کہ جب وہ کسی پر سوار ہو جائیں تو پھر انسان خارجی ماحول اُس کی دقتوں اور مزاحمتوں کی پروا کیے بغیر مردانہ وار آگے بڑھتا ہے غالباً اسی نشہ سے سرشار ہو کر ہمارے فاضل مصنف جناب احمد عبداللہ المسدوسی نے یہ کام شروع کیا ہے اور عشق کا یہی جذبہ انہیں کشاں کشاں کامیابی کی منزل تک لے گیا۔

زیر تبصرہ کتاب میں فاضل مصنف نے مختلف مذاہب پر ایک مبسوط اور سیر حاصل تبصرہ کر کے اُن کے ماننے والوں کی صحیح صحیح تعداد کا تعین کیا ہے۔ یہ دوسرا کام اس قدر مشکل اور کٹھن تھا کہ خود انہیں بھی آغاز میں اس کے پایۂ تکمیل تک پہنچ جانے کی توقع نہ تھی۔ ایک ایسا ملک جس میں صحیح

اعداد وشمار کے بہم پہنچنے کے معقول انتظامات نہ ہوں وہاں اس قسم کے کام کا بیڑا اٹھانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ ان کے اس کام کی دقتوں کا صحیح اندازہ مندرجہ ذیل الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔

"افریقہ کی آبادی کے نہایت اُلجھے ہوئے مسئلہ کو جانچنے کے لیئے میں نے افریقہ پر تیس سے زیادہ کتابیں پڑھیں جو کراچی میں مجھے مل سکیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ پہلی دفعہ اس کتاب میں استعمار کے ڈالے ہوئے وہ آہنی پردے اٹھتے ہوئے نظر آئیں گے جنہوں نے مجموعی حیثیت سے افریقہ کی آبادی اور مسلم آبادی کی اکثریت کو دنیا کی نگاہ سے اوجھل کر دیا تھا۔ چین اور روس کے علاقوں کے اعداد وشمار اور مسلم آبادی کے مسائل کا حال بھی مختلف نہیں جو آہنی پردے کے پیچھے کے ممالک ہیں اُن کی مشکل سوا ہے۔ پہلے تو خود یہ ممالک مسلمانوں سے متعلق کوئی معلومات فراہم نہیں کرتے اور جو اعداد وشمار پیش کرتے ہیں وہ بداہتاً غلط اور یک طرفہ ہوتے ہیں اور دوسرے مغربی ممالک جو اعداد دیتے ہیں ان میں روسی دشمن اور جانبداری کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں سے بچ کر صحیح حقیقت کو معلوم کرنا ٹیڑھی کھیر ہے اور سخت جانکاہی کا کام۔ تاہم توفیقِ ایزدی سے یہ مہم بھی بڑی حد تک سر ہوئی ہے اور ان ممالک کے اعداد خصوصاً مسلمانوں کے اعداد کے بارے میں قریبی اندازے معلوم ہو سکے ہیں۔"

۱۹۵۵ء میں امریکی رسالہ لائف میں دنیا کے بڑے مذاہب کے متعلق جو مضامین شائع ہوئے اس میں عیسائیوں کی تعداد نوّے کروڑ، بدھ متیوں کی پچاس کروڑ، ہندوؤں کی تیس کروڑ سے زائد اور مسلمانوں کی تیس کروڑ دکھلائی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے مستند اعداد کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تعداد بالکل غلط ہے اور عیسائی فی الواقع پچھتّر کروڑ۔ بدھ متی صرف ۱۵ کروڑ، ہندو بائیس کروڑ اور بشمول اچھوت ستائیس کروڑ سے کچھ زائد ہیں اور مسلمان جن کی تعداد تیس کروڑ دکھائی گئی ہے وہ درحقیقت باون کروڑ ہیں۔

ان مباحث کے علاوہ اس کتاب میں ۷۴ جدولیں (SCHEDULES) اور ۹ نقشے ہیں۔ آخر میں استعمار کی تاریخ درج کر کے فاضل مصنف نے اس کتاب کی افادیت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔

کوئی شخص بھی کسی انسانی محنت و کاوش کو مکمل اور آخری نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تلاش و تحقیق کے اعتبار سے یہ کتاب مشرقی مطبوعات ہی میں نہیں بلکہ عالمی ادب میں بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں بعض مقامات پر کتابت کی غلطیاں محسوس ہوئیں۔ تبصرہ نگار کی رائے ہے کہ اگر آئندہ اشاعت میں یہ ممکن ہو تو اس کتاب کو ٹائپ میں چھپوایا جائے۔ کیونکہ ایک ایسی تصنیف میں جو اعداد و شمار سے بھری پڑی ہے ٹائپ کے بغیر صحت کا اہتمام نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کتاب اس قابل ہے کہ اسے ہر لائبریری اور کتب خانہ میں جگہ ملنی چاہیے۔ ہم اس فاضلانہ تصنیف پر فاضل مصنف کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

اساس تہذیب | مرتبہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب۔ شائع کردہ: دی انسٹیٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز، حیدر آباد۔ قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ صفحات ۱۹۶۔ طباعت و کتابت کا معیار عمدہ

کتاب کے مرتب ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب علمی دنیا کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی تصنیفات اسلامی تمدن (انگریزی) اور "وہ ذہن جس کی تشکیل قرآن کرتا ہے" (انگریزی) اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں انہوں نے ایک سلیقہ کے ساتھ قرآن و سنت کی تعلیمات کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ اس سے خود بخود ایک عالمگیر تہذیب کا نقشہ مرتب ہو جاتا ہے۔ ہر حصہ کے آغاز میں ایک نوٹ بھی شامل ہے جو ان مسائل کے متعین کرنے میں کارآمد ثابت ہو سکتا ہے جو عہدِ حاضر میں پیدا ہوئے ہیں۔ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے پہلا حصہ ایمان باللہ، دوسرا مذہباً للعباد، تیسرا قرآن کا اقتصادی نظام اور چوتھا اسلام کے معاشرتی نظام سے بحث کرتا ہے۔ یہ کوشش یقیناً مستحسن ہے مگر اس کے مطالعہ کے بعد ذہن ایک تشنگی ضرور محسوس

کرتا ہے کیونکہ اس میں تعلیماتِ الٰہی کے بہت سے گوشے نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔

خـــالی صفحـــه

رسالہ دینیات

از

سید ابوالاعلیٰ مودودی

یہ رسالہ ہائی سکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے لکھا گیا ہے - اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے - مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے - اس میں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں -

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں - نیز علماٗ بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں - کیونکہ یہ رسالہ ان کو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے -

ضخامت (۲۰×۳۰/۱۶) ۱۶۰ صفحات - قیمت ۱/۱۲ روپیہ

ہر طرح کی دینی - علمی - اخلاقی - اصلاحی - اسلامی - معاشرتی اور معاشی کتابیں ملنے کا پتہ

ادارۂ ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور

مطبوعہ پاکستان پرنٹنگ ورکس - لاہور